غالب

اور انقلابِ ستاون



ڈاکٹر سید معین الرحمن

غالب اور اِنقلاب ستاون

غالبؔ اور انقلابِ ستاون

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
ایم اے، پی ایچ، ڈی
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

سنگِ میل پبلی کیشنز
چوک اردو بازار - لاہور

بار اوّل : ۱۹۷۴ء
نیاز احمد
نے منظور پریس، لاہور
سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت : ۱۵/۰۰ روپے

مندرجات :

○

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

مشاغل: ریسرچ اسکالر، ترقیِ اُردو بورڈ، کراچی ۱۹۶۳ — ۶۴ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، بہاول نگر ۱۹۶۴ — ۶۵ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۶۵ — ۶۶ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور ۱۹۶۷ — ۱۹۷۳ء

موجودہ مصروفیت: وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

تصنیفات و تالیفات:

۱۔ بابائے اُردو — احوال و افکار ۱۹۶۴ء

۲۔ سید وقار عظیم (سوانحی خاکہ) ۱۹۶۷ء

۳۔ نقدِ عبدالحق ۱۹۶۸ء

۴۔ خیالستان (ترتیب مع مقدمہ) ۱۹۶۸ء

۵۔ اِشاریۂ غالب ۱۹۶۹ء

۶۔ آپ بیتی: رشید احمد صدیقی ۱۹۷۰ء

۷۔ مطالعۂ یلدرم ۱۹۷۱ء

۸۔ غالبیات کا تحقیقی مطالعہ ۱۹۷۲ء

۹۔ غالب اور انقلاب ستاون ۱۹۷۴ء

مُستقل پتا:

بہاول نگر: رحمٰن اسٹریٹ نمبر۱، بہاول نگر

لاہور: ۱۴۶- راوی روڈ، لاہور (۲)

اُستادِ مُحترم

پروفیسر ڈاکٹر غُلام مُصطفیٰ خاںؔ صاحب قبلہ

کی نذر

ع

"بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

نیاز اور نیاز مند!

کاغذ کی اِس گرانی اور کمیابی
کے زمانے میں نیاز احمد صاحب
کا اِس نیاز مند کی کتاب چھاپنا
—— ہو سکے کیا مدح :

"فکر اچھی پر ستائش ناتمام"

دیباچہ:

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

پیشِ نظر کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے فارسی روزنامچے "دستنبو"[1] کے تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ "دستنبو" کے اردو ترجمے پر مبنی ہے۔ تیسرا حصہ سن ستاون کے بارے میں غالب کے غیر رسمی نقطۂ نظر کا حامل ہے، اس کا ماخذ غالب کے خطوط ہیں، اور آخری حصہ کتاب میں انقلابِ ستاون اور غالب کے شعری رویے سے بحث کی گئی ہے۔

(۱)

"دستنبو" اپنے مضمون و موضوع اور اندازِ نگارش و گزارش ہر دو کی بنا پر تصانیفِ غالب میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ غالب نے یہ کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں روزنامچے کے انداز میں لکھی۔ کتاب میں بعد توطیہ و تمہید ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک مصنف کی سرگذشت بیان ہوئی ہے۔ بہ حیثیت اقتضائے مقام، کتاب میں عام واقعات و حالات اور بر بنائے

---

[1] "دستنبو": (دَش۔تَم۔بُو) پختہ زرد سیند جس کو ہاتھ میں لے کر سونگھتے ہیں، شمامہ۔

(فرہنگ عامرہ، طبع چہارم، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۲۶۶)

"دست انبو و دست انبوی"۔ رک: "دست انبویہ" (یار دست انبو بدستم داد و دستم بو گرفت)۔

"دست انبویہ": گلولہ ای باشد مرکب از عطریات کہ آنرا بجہت بوییدن بر دست گیرند و بہ عربی شمامہ خوانند۔ و ہر میوہ ای را کہ توان بویید عموماً۔ و نباتی باشد کوچک دگرد دالوان شبیہ بخربزہ کہ آنرا دستبوی گویند خصوصاً۔

(برہان قاطع جلد دوم، مرتبہ ڈکتر محمد معین، تہران ۱۳۳۱ شمسی، ص ۸۵۶)

DASTAMBU : A Posy of Flowers.

[Ghalib—Life and Letters, London, 1969, p. 132

by : Ralph Russell and Khurshid ul Islam] .

تقریب شہر و سپاہ کی رُوداد بھی آگئی ہے، اور یہ سرگذشت ایسی فارسیِ قدیم میں بیان ہوئی ہے جس میں نہ خود غالب کی کوئی اور کتاب لکھی گئی اور نہ "دستنبو" کے لکھے جانے کے بعد سے آج تک برِعظیم پاک و ہند میں کسی اور نے کوئی کتاب اس زبان میں لکھی۔

○

رُوداد نگاری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے، غالب نے "دستنبو" میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"اِس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گذر رہے ہیں، یا اُن واقعات کا ذکر ہے جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شُنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ مَیں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے خدا کی پناہ نہیں چاہی بلکہ انگریز ناخداؤں کی پناہ چاہی جنہوں نے دار و گیر کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ غالب نے اپنی نجات ضرور ڈھونڈی لیکن یہ فی الوقت انہیں سچائی میں دکھائی نہیں دیتی تھی، اس لیئے انہوں نے حالات کو جہاں تہاں نہ صرف "کچھ کم کر کے" بلکہ رنگ آمیزی کے ساتھ "بڑھا چڑھا" کر بھی پیش کیا۔

○

"دستنبو" پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ سے چھپی۔ یہ وُہ زمانہ تھا کہ پریس کی آزادی مسدود کی جا چکی تھی، ۱۳؍جون ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ کے حکم پر، جدوجہدِ آزادی کی تائید و ترغیب کے "جرم" میں ایک سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا تھا۔ اخباروں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ انضباطی کارروائیاں عمل میں آرہی تھیں۔ طابع، ناشر اور ایڈیٹر دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک مراسلے (مورخہ ۴؍جولائی ۱۸۵۷ء) میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بغاوت کے حالات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"کلکتے کے ایک لیتھوگرافک پریس کا اجازت نامہ بھی ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپے خانے کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے۔ یہ قدم ہم نے اِس وجہ سے اُٹھایا کہ اسی چھاپے خانے میں ایک فارسی اخبار.... چھپتا تھا، جس میں.... دو انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے[1]۔"

---

1. Parliamentary Papers, Vol. 44, pt., I, p. 363

(بحوالہ: اٹھارہ سو ستاون اور اخبارات، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۴۰۴)

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس کے اجازت نامے منسوخ ہو رہے تھے۔ اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے اور بجائے خود پریس بھی سرکار ضبط ہو رہے تھے۔ ان حالات میں کسی ایسی کتاب کی اشاعت و طباعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو انگریز حکام عالی مدار کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا کہ:

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے ...... اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو تفتہ کا تذبذب میں پڑ جانا قدرتی اور یقینی امر تھا، غالب اُستادِ شاہ تھے، کہیں یہ رُوداد شہر بہادر شاہ کی تائید و تحسین اور کمپنی بہادر کے اقدامات کی تردید و تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عاید پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت و اشاعت کے لیے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ تفتہ نے جواباً اِس نوع کے خدشات کا اظہار کیا۔ اس پر غالب نے اُنہیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور کتاب کے اندازِ نگارش و گزارش کی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی:

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اِس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں، اس واسطے ہے کہ اُس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر (لارڈ کیننگ) کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہو گی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہو گا؟"

(بنام: تفتہ، مابین ۷ و ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء)

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد کتاب کی اشاعت میں رُکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ بایں ہمہ احتیاطاً:

"صاحبِ مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ (دستنبو کا مسودہ) آگرے کے حُکام کو دکھایا (چھاپنے کی) اجازت چاہی۔ حُکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔"

(بنام: مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اور کتاب "دستنبو" نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپ گئی۔

اس پسِ منظر میں دیکھیے کہ "دستنبو" جون ۱۸۵۷ء کے جابرانہ پریس ایکٹ کے باوجود چھپ سکی، صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع نامطبوع نہ ہوا اور انگریز حکام نے پیشگی ملاحظے کے بعد "بکمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ "دستنبو" میں غالب بقول شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کے قلم سے اسے لکھا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے۔ مگر یہ چار جزو کا رسالہ ("دستنبو") جو اب بھیجا ہے۔ اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسی قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ با ایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔"

(غالب، بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، والیٔ رامپور، نومبر ۱۸۵۸ء)

حقیقت یہ ہے کہ کتاب، یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی ہے۔ اس میں انگریز حکام سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔

○

"دستنبو" کی غرضِ تصنیف، قلعۂ معلّٰی سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکامِ بااختیار کی نظر میں سرخرو ہونا تھا۔ اور سرخرو ہونا، محض سرخرو ہونے ہی کے لیے نہیں تھا، حکامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی، پنشن کے اجرا کی آرزو، اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی

"کاش! میری ان تین خواہشوں، یعنی: خطاب و خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے، جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے ...... اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے، میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔" (خاتمۂ دستنبو)

انگریز حکام کے لئے "دستنبو" کی پُرتکلف جلدوں کے اہتمام اور انصرام، قصیدۂ تہنیت فتح ہند کی تصنیف، اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر، ملکۂ انگلستان اور عالی مقام حکام تک کتاب پہنچانے کی جلدی اور ذی شان صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور رہ و رسمِ مراسلت کی فکرِ تجدید کی تفصیلات سے غالب کے خط بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب صورتیں اپنے مقصودِ اصلی: پنشن، خطاب اور خلعت کے لیے راہ ہموار کرنے کی ہی کڑیاں ہیں۔ چنانچہ ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی اس

کتاب کے مندرجات کو "حقیقتِ واقعی" کے بمنزلہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سرگزشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کی تابع رہی ہے۔ جس نے بطور کتابِ تاریخ اس کی اہمیت و افادیت کو شدید ضعف پہنچایا ہے بایں ہمہ اِس کی یہ اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے، اور بالخصوص اُن کے افتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

○

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

(غالب، بنام: انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"فارسی، بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں رہا، تابہ ہندوستان چہ رسد؟"

(غلام نجف خاں (؟)، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم، اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

"بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ بدلے نہیں جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔" (چودھری عبد الغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے۔"

(یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

"کتاب مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی۔"

(سرورق: دستنبو، نومبر ۱۸۵۸ء)

○

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان قدیم فارسی میں پیش کرنا حکمت سے خالی نہیں تھا۔ اِس "دزناپچے" کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار و اشتہار،

یعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انہیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پرانے نظام کا حامی اور نئی عملداری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ: "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِ مقابل آگئی تھیں (۱۸۵۷ء میں) بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں"[۱]۔

شاہ کے مقابلے میں، فرنگیوں کے لیے، اہلِ ہند کے دل میں گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی دارو گیر نے اُن کے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تائید و تحسین میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا، اس سے بچنے کے لیے غالب نے یہ سرگزشت متعارفہ اور مُروّجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے، فارسیٔ قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لئے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی مُتعارفہ اور مُروّجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی میں یہ رُوداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و بیگانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لئے کتاب، قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حُکام کو تو، جو اس کتاب کے مخاطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے اس قفل کو کھلوانا ہی تھا، غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے سربستہ راز رہے تاکہ وہ اُن میں معصوم، اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

۱۔ خلیق احمد نظامی، مُقدمہ: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۱

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکام نے اُن کے کمال فن کی داد دی۔ پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی۔ عالی مقام حکام سے رہ و رسم مراسلت بدستور جاری ہو گئی، اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی، قلعۂ معلّیٰ سے تعلق کی صفائی ہو گئی۔ عذرِ بے گناہی مسموع ہُوا۔ اک گونہ سکون ہُوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لئے خرخشہ نہ رہا۔ پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔

(۲)

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سُن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہو گا۔ کیونکر کہوں کہ صاحب ("دستنبو" کی) اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو مفصل لکھو ـــــ" (غالب، بنام، آرام، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

"مبالغہ اس کتاب (دستنبو) کی تصحیح میں اس لئے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بنام: مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مرسل الیہ کے مطالعے میں ہے۔ پھر بہ نسبت اُس دوسری کتاب کے قسمت کی اچھی ہے۔ یعنی خود ملاحظہ فرمارہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہو گا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔" (بنام: بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہُوا ہے، وہ اہلِ علم میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ وناآشنا ہے۔ خدا کرے، وہ جو اس کی سیر پر مامور ہیں ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں۔ اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔

(بنام: بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے۔ فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے۔ سو وہ بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بیگانہ وناآشنا ضرور ہے۔ اس لیے اہلِ علم وفضل بھی اس عبارت پر سے سرسری گزر سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا کہ کتاب اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔ یہ اسی شعوری کوشش کے

ساتھ لکھی بھی گئی تھی ۔

"دستنبو"، مشیر الدولہ رائے امید سنگھ بہادر کی مالی اعانت سے چھپنا شروع ہوئی تھی۔ وہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل اور والیٔ اندور کے اتالیق تھے۔ لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی، غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے[1]۔

غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر، اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" تشکیل[2] دے دی تھی۔ جو آگرہ میں کتاب کی تحریر، تصحیح، تزئین، تصحیف، تجلید اور طباعت و اشاعت کے لئے سرگرمِ عمل تھی۔ ترتیب و کتابت اور اشاعت و طباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل"، جو غالب کے بعد، کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے[3] سے معذور رہی۔

عہدِ غالب میں، جب کہ ہر طرف فارسی ہی کا چلن تھا، کتاب فہمی کی یہ سطح اور شرح رہی ہو تو روز بروز فارسی سے ناآشنا ہونے والی اُردو دنیا میں، اب اس کے سمجھنے والے جتنے ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مروّجہ اور غیر متعارفہ فارسی میں ہونے کی بنا پر "دستنبو" عہدِ موجودہ کے لیے عملاً خزانۂ در بستہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے براہِ راست اخذِ مطالب کرنے والوں کی تعداد آج بہت زیادہ نہیں۔

اِس ندرت اور ضرورت کے پیشِ نظر اگلے صفحات میں "دستنبو" کے تفصیلی تعارف کے ساتھ ساتھ پوری کتاب کا اردو ترجمہ بھی دیا جارہا ہے تاکہ عام قاری بھی اس کتاب کے نہاں خانے میں جھانک کر جان سکے کہ غالب نے اس میں کہا کیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ "دستنبو" کا اِتنا مفصل جائزہ اور اس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ نامۂ غالب بنام: تفتہ، مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء، یکم ستمبر ۱۸۵۸ء

۲۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد اوّل، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵

۳۔ نامہ غالب، بنام: آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء

(۳)

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے.... اور پھر کام کیسا، کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خُدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل ("دستنبو") کی طباعت پر توجہ فرماؤ۔" (غالب بنام تفتہ، ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء)

غالب نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، اور یہ مقاصد و مطالب انگریزوں سے وابستہ تھے۔ اس لئے انہوں نے انگریزوں کی معقولیت کے گن گائے ہیں۔ اُن کے مظالم کے لئے جواز پیدا کئے ہیں، زیادتیوں کو بہت کچھ کم کر کے بیان کیا ہے اور اُن کی سختیوں کو فطری و معمولی قرار دیا ہے۔ جب کہ دیسی سپاہیوں کو شوریدہ سر، دیوانہ و آوارہ، بدباطن، بے رحم قاتل بتایا ہے اور انہیں خبیث، خنزیر، اور نمک حرام فسادی ٹھہرایا ہے اور اُن کے طرزِ عمل کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب قومی نقطۂ نظر سے لکھی ہی نہیں گئی۔ یہ اپنی مدافعت اور انگریز حکومت کی خیر خواہی میں ہے۔

اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کے "فتنہ و فساد" کا ماتم کئی برس تک بطور خاص خطوطِ غالب کا موضوع رہا جو زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے گئے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی۔ اس لئے اس موضوع پر خطوں میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بڑی حد تک اُن کی غیر رسمی اور سچی رائے ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

"دستنبو" اور خطوطِ غالب میں موجود متعلقہ مواد کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہم غالب کو کشمکش کا شکار پاتے ہیں۔ جذبات کا مطالبہ اور تھا، مصلحت کا تقاضا کچھ اور.... خطوں میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور اُن کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے ـــــ "دستنبو" میں حقیقی جذبات ہنگامی مصلحت کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"گو ضرورت و احتیاج نے انہیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹ پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے (نظم و نثر میں) لکھوائے تھے، تاہم "میرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور ساٹھ ستر روپے (کی پنشن اور) خلعت اُس زخمِ کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا، جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے، علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر۔"

(غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۶۲)

۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی محسوسات کا اظہار، اُن کے خطوں میں ہوا ہے ـــــــ انقلابِ ستاون کی جو جستہ جستہ رُوداد، خطوطِ غالب میں چھپی لیکن منتشر ہونے کی بنا پر چھپی ہوئی تھی اور اس انقلاب کے اثراتِ مابعد کی جو جھلکیاں غالب کے خطوں میں محفوظ لیکن بکھری ہوئی تھیں، زیرِ نظر کتاب کے تیسرے حصے میں، انہیں مرتب اور یک جا کر دیا گیا ہے۔

یہ تفصیلات ایک ایسے شخص کے قلم سے ہیں جو پُرزور اسلوب کا مالک تھا، اس لیے متاثر اور متوجہ کرتی ہیں۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ پھر یہ اطلاعات اس لیے بھی قابلِ توجہ ہیں اور عینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کہ لکھنے والے نے دلّی میں بیٹھ کر، اُس وقت فراہم کی ہیں جب موجِ خوں سر سے گذر رہی ہے۔

یہ مواد بجائے خود تاریخ نہیں، لیکن تاریخ کے معتبر ماخذ کی حیثیت سے بے حد قیمتی ہے۔ یہ دہلی اور اہلِ دہلی کی تباہی کا دلگداز مرثیہ اور اُن کے طرزِ احساس کا نادر مرقع ہے جس کے نقوش کی بنیاد پر انقلابِ ستاون کی معروضی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

جد و جہد آزادی کے ضمن میں خطوطِ غالب کے بیانات جا بجا "دستنبو" کے مندرجات سے مختلف اور متصادم ہیں، اور یوں دونوں کے تقابلی مطالعے سے غالب کی سیرت و شخصیت کی تخمین و تعیین کا ایک نیا پیمانہ ہاتھ آتا ہے۔

(۴)

آخری حصّہ کتاب میں اِس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اس حادثۂ کبریٰ پر غالب کا شعری رویّہ کیا رہا اور اس مصیبتِ عظمیٰ کا اُن کے شعر اور بحیثیتِ مجموعی اُن کی شعرگوئی پر کیا اثر پڑا؟ غالب معروف معنوں میں اُردو شاعر اور نثر نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انقلاب ستاون نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور، اِس انقلاب کے بعد ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ غالب کو اس تناظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ کتاب کا یہ حصّہ بھی شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

○

انقلابِ ستاون کے موضوع پر غالب نے اپنے خطوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں، غالب کی فقط ایک اردو تحریر ملتی ہے۔ یہ ان کا ایک مختصر مضمون ہے جو انھوں نے دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے (منعقدہ ۱۱؍اگست ۱۸۶۵ء) میں سوسائٹی کے سرپرست کرنل ہملٹن کمشنر دہلی کے ایما پر پڑھا۔ اس نادر تحریر کو کتاب کے ضمیمۂ اوّل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہند میں کمپنی راج کا خاتمہ ہو گیا اور ملکۂ وکٹوریہ کے ایک اعلان کے مطابق برعظیم براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اس پر غالب کا ردِّعمل ایک تہنیتی قطعے اور قصیدے کی صورت میں سامنے آیا۔ جب کہ ملکۂ وکٹوریہ کے اعلان کے جواب میں اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل نے ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا ایک ایک حرف حضرت محل کی بیدار مغزی اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اعلان اور فرمان دیدنی ہے۔ یہ دستاویزیں جس شکل میں مل سکیں ضروری حواشی کے ساتھ، بطور ضمیمۂ دوم، آخرِ کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یقین ہے کہ یہ تحریریں توجہ سے پڑھی جائیں گی اور سامانِ بصیرت فراہم کریں گی۔

○

اِنقلابِ ستاون سے متعلق غالب کی چار نادر قلمی تحریروں کے عکس (صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۴۲،) اور غالب کے حوالے سے تین تصاویر (صفحہ ۱۷۱، ۱۹۷، ۱۹۸) بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ سب تحریریں اور

تصویریں راقم کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہیں اور پاکستان کی حد تک پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ انھیں شوق اور دلچسپی سے دیکھا جائے گا۔

○

یہ کتاب برِعظیم کے نامور اور بزرگ ترین غالب شناس، مصوّرِ مشرق محمد عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے کلماتِ استقبال کے ساتھ سامنے آرہی ہے، اس لطفِ خاص کا شکر کیونکر ادا کیا جاسکتا ہے! سیّد عابد علی عابد نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: "دراصل یہ نزولِ برکات اور صدورِ حسنات ہے کہ ہم میں چغتائی جیسا فن کار موجود ہے جسے مغرب کے نقاد بھی چوٹی کا مصوّر تسلیم کرتے ہیں، اور جس کی تصاویر کی نمائش یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہو چکی ہے:"

"مرقعِ چغتائی" (۱۹۲۸ء) اور "نقشِ چغتائی" (۱۹۳۵ء) کے نام سے دیوانِ غالب کی دو مصوّر اور سدا بہار اشاعتوں کی ترتیب و تزیین اور کلامِ اقبال کے مصوّر ایڈیشن "عملِ چغتائی" (۱۹۶۸ء) کا سا زندہ جاوید اور عہد آفریں کارنامہ انجام دینے کے بعد آج کل چغتائی صاحب کے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ" الہامی کتاب" کے نام سے غالب کا ایک نیا ایڈیشن شائع کریں۔ اس کا نام انھوں نے "کارِ چغتائی" تجویز کیا ہے۔ یہ کام جس کی طرح وہ ڈال چکے ہیں، ان کی آرزو کے مطابق پورا ہو گیا، اور خدا کرے پورا ہو جائے تو یہ بڑا کام ہوگا اور نہ صرف "بجنوری کی تنقید اور الہامی کتاب کی بشارت کو پورا کرے گا" بلکہ خود صاحب کار و کتاب کو بھی لازوال تر بنا دے گا۔

○

زہرا نے اپنے کالج کی معلّمی اور خانہ داری کے دوہرے بکھیڑوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے آرام و اطمینان کا ایسا ماحول فراہم کیا جس کے بغیر توجہ اور یکسوئی سے لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کر لینا مجھ سے ممکن نہ ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تشکر کے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب زہرا کی رفاقت اور اعانت ہی کا حاصل ہے:

روشن اسی کے دم سے ہیں شام و سحر مرے
پرتو اسی کا کچھ مرے افکار میں بھی ہے

۸۔ جون ۱۹۷۴ء — ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

کلماتِ استقبال :

— مُصوّرِ مشرق محمد عبدالرحمٰن چغتائی

غالب کے انتقال کو ایک صدی سے اُوپر زمانہ گزر گیا۔ یہ غالب کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ہر زمانے میں منتخب سخن فہم نصیب رہے۔ کمسن غالب کو میر تقی میرؔ نے پہچانا، پختہ کار غالب سے، حالؔی دوچار ہوئے۔ حالی کی "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) سے مُطالعۂ غالب کا ایک مہتم بالشّان دور شروع ہُوا۔ پھر اپنے اپنے وقت پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر سیّد محمود، ڈاکٹر سید عبداللّطیف، تکلّف بر طرف خود راقم الحروف، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، قاضی عبدالودود، مالک رام، پروفیسر حمید احمد خاں اور، ڈاکٹر شوکت سبزواری نے غالبیات میں اپنی دھاک بٹھائی۔ ان میں سے دو تین کے علاوہ سب اپنا کام ختم کر چکے اور خود ختم ہو چکے، باقی جو ہیں وہ تیار بیٹھے ہیں ؏۔

سدا رہے نام اللہ کا!

خوشی کی بات یہ ہے کہ نثرادِ نو بھی بڑی حد تک غالب کی اسیر ہے۔ نئی نسل میں غالبیات سے انہماک کی ایک نمایاں اور روشن مثال ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی ذات ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے لیے انھوں نے "اشاریۂ غالب" ایسی اہم کتاب لکھی، سندھ یونیورسٹی کے لیے انھوں نے غالب پر تحقیقی کام کیا اور سندِ فضیلت پائی اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی ان کا حریف نہیں، پاکستان بھر میں معین صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس نے غالب پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر کام کیا ہو۔

اب "غالب اور انقلابِ ستّاون" کے حسّاس موضوع پر ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی زیرِ نظر کتاب سامنے آرہی ہے۔ یہ غالب کا معروضی مطالعہ ہے اور غالب کو ایک بالکل نئے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ معین صاحب نے ایامِ انقلاب میں غالب کے رول کو کامیابی کے ساتھ متعین کیا ہے، اور انقلابِ ستّاون کے حوالے سے غالب کے شعری رویّے کا احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ "اِس اِنقلاب نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا جبکہ نثر نگار غالب نے اس انقلاب کے بعد ظہور پایا۔"

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے اپنے اِس موقف کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے اور اسکی تائید میں ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور اس خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ ان کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔ مختصر یہ کہ معین صاحب کی یہ کتاب مواد کی فراہمی، نتائج کے استنباط اور اپنے سلیقۂ اظہار کی بنا، پر اَدبِ غالب میں بہت قیمتی اور گراں قدر اضافہ ہے ——— امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کا پُرجوش اِستقبال کیا جائے گا۔

لاہور۔ ——— محمد عبدالرحمٰن چغتائی،

۴۔ جون ۱۹۷۴ء

○

"دستنبو" کا تعارف

غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی اشاعتیں

"دستنبو" کا موضوع اور حدِ موضوع

"دستنبو" تجویز سے طباعت تک (خطوط کے آئینے میں)

دستنبو کی جابجا ترسیل

انگریز حکام سے راہ و رسمِ مراسلت کی تجدید

پنشن کے اجرا کی امید

"دستنبو" اور نئے انعام کی آرزو

"دستنبو" میں ملکۂ وکٹوریہ کی مدح کا قصیدہ

طبع اول کا سرورق

طبع اول کے خاتمے کی عبارت

مہر اور تفتہ کے قطعاتِ تاریخ اور حقیر کا کتاب سے تعلق

"دستنبو" کی زبان : فارسیٔ قدیم

فارسیٔ قدیم کے اختیار میں حکمت

"دستنبو" اور اردو خطوط کی جمع و ترتیب

طبع اول کا انکاس اور خاتمہ

"دستنبو" کے مندرجات کی حقیقت

"دستنبو" کی غرضِ تصنیف اور اہمیت

"دستنبو" کے دوسرے ایڈیشن کی غایت اور اس کا تعارف

"دستنبو" کی تیسری اشاعت "در کلیات" کے کوائف

انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں

"دستنبو" کے ایک قلمی نسخے کی نشاندہی :

"دستنبو" غالب کی زندگی میں تین بار شائع ہوئی، دو بار جداگانہ اور ایک بار "کلیاتِ نثر" کے ساتھ ان تین اشاعتوں کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

۱۔ طبع اول: مطبع مفید خلائق، آگرہ، نومبر ۱۸۵۸ء
نگران اشاعت: تفتہ، حقیر، مہر اور آرام
ضخامت: ۸۰ صفحات
مسطر: ۱۳ سطری

۲۔ طبع دوم: مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی ۱۸۶۵ء
باہتمام: منشی پھندن لال
ضخامت: ۷۱ صفحات
مسطر: ۱۵ سطری

۳۔ طبع سوم در: "کلیاتِ نثرِ غالب":
مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء
باہتمام: منشی نولکشور
ضخامت: ۲۳ صفحات (صفحہ ۱۸۹ تا ۲۱۲)
مسطر: ۲۹ سطری

"دستنبو" طبع اوّل (۱۸۵۸ء) کے سرورق پر کتاب کے موضوع اور حدِ موضوع کو ان کلمات سے ظاہر کیا گیا ہے:

"کتاب مستطاب نایاب --- جس میں مصنف نے اپنی سرگذشت ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔"

پہلی بات تو یہ کہ غالب نے صرف "اپنی سرگذشت" ہی نہیں لکھی، بہ حیثیت اقتضائے مقام، کتاب

میں عام واقعات وحالات اور بربنائے تقریب شہرو سپاہ کی روداد بھی درج کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سرگذشت کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ابتداء سے نہیں ہوا، بلکہ کتاب بعد توطیہ وتمہید ۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے:

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔" (نامۂ غالب بنام: انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن[1] گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل، زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی۔ جو سنا گیا، وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔" (چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸؍نومبر ۱۸۵۸ء)

"میں نے آغاز یاز دہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔" (منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷؍اگست ۱۸۵۸ء)

"مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے۔" (یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

---

[1] شفق کو (اُوپر) لکھ چکے ہیں کہ "دستنبو" میں اپنی سرگذشت اور "مُشاہدے" سے کام رکھا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ فساد شروع ہونے کے پہلے دن ۱۱؍مئی ہی سے انہوں نے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا تھا تو پھر "مشاہدے" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے قلعہ مُعلّٰی کی حاضری بیک قلم ترک نہیں کی جیسا کہ والئ رامپور کے نام اُن کے ایک فارسی خط مؤرخہ ۲۴؍جنوری ۱۸۵۸ء سے ہویدا ہے۔ غالب کی مصلحت بیں طبیعت کے پیشِ نظر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے بیک آن ترکِ تعلق کر لیا ہوگا۔ بعض معاصر شہادتیں بھی اس امر کی موجود ہیں کہ غالب "فساد" کے ایام میں قلعے جاتے رہے ہیں۔ عبداللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ: ۱۹؍رمضان ۱۲؍مئی ۱۸۵۷ء صبح کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالب، ایوان شاہی میں آداب بجالانے کے لئے حاضر ہوئے اور زمیں بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لئے مرتبۂ "خانہ زادی" سے بہرہ اندوز ہوئے۔" (ترجمہ، صفحہ ۱۲۳) عبداللطیف نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱؍اگست ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر سنایا اور خلعت زیب تن کیا" (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ ومترجمہ خلیق احمد نظامی دہلی ۱۹۵۸ء) نیز رجوع کیجئے، غدر کی صبح شام، حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۶۹

"مئی سال گزشتہ سے جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔" (ترجمہ خاتمۂ دستنبو)

"یکم اگست (۱۸۵۸ء) تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

(میر مہدی مجروح، ۸ر اگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام، وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔" (بنام نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آ گیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سوا ابتدا ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آ گیا۔" (منشی شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کے خطوں میں، دوسری تصانیف کے مقابلے میں "دستنبو" کا ذکر اور اس کی اشاعت کی روداد بالتفصیل محفوظ ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم[1] نہیں۔ غالب لکھتے ہیں:

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی اپنی سرگذشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔ شیو لزوم مالا یلزم مرعی رکھا ہے، یعنی فارسی بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان بھی نہیں۔ تا بہ ہندوستان چہ رسد؟ چالیس صفحے لکھ چکا ہوں۔ اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنشن

---

[1] رسالہ "تصویر جذبات" کے ایڈیٹر سید احمد عزیز کیفی نے اس خط کو اپنے رسالے، شمارہ فروری ۱۹۲۷ء میں شائع کیا اور لکھا کہ یہ خط اُن کے جدِ امجد کے نام ہے لیکن اپنے دادا کا نام نہیں بتایا۔ اس رسالے سے صفدر مرزا پوری نے اس خط کو اپنی تالیف مرقع ادب (ج ۲، ص ۲۴-۲۵) میں نقل کیا اور اس طرح یہ خط غالب کے مختلف مجموعۂ مکاتیب کا حصہ بنا۔ فاضل لکھنوی نے (اردوئے معلّٰی، صدی ایڈیشن، ص ۹۸۹-۹۹۰) اسے شیو نرائن آرام کے نام قرار دیا ہے جو صریحاً غلط ہے، اس لیے کہ آرام سے غالب کا تعارف تفتہ کے ذریعے ہوا اور اس خط کی تاریخ تحریر کے کئی ہفتے بعد ہوا۔ بعض داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ جس کسی کے نام بھی ہے اُس سے غالب کی پرانی مراسلت ہے، نیا تعلق نہیں۔

کا مقدمہ طے ہو چکے، ملے یا جواب ملے اور میں بہ ہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں، ہاں اس کے وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے معلوم ہوگا، وہ ناچار لکھوں گا۔ یہاں کوئی چھاپہ خانہ نہیں ہے اگر اجازت دو گے تو بعد اختتام ان اوراق کو تمہارے پاس بھیج دوں گا تاکہ ہزار جلدیں طبع ہو کر اجزائی ہوئی قلمرو ہند میں پھیل جائیں"۔

۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء تک غالب چالیس صفحے لکھ چکے تھے۔ اتمام میں انتظار یہ تھا کہ پنشن کا معاملہ طے ہو لے اور عزم یہ تھا کہ وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے ہوگا وہ اسے قلمبند کریں گے لیکن انہی ایام میں منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے، ایک دوست انہیں غالب کے ہاں لے آئے۔ انہوں نے مسودہ دیکھا اور مالی اعانت سے کتاب چھپوانے کا قصد ظاہر کیا۔ اس ہنگامِ رستخیز میں طباعت کا انتظام ہونا عجائبات میں سے تھا۔ غالب نے "خوبانِ روزگار" منشی اُمید سنگھ کی اس پیش کش کو غنیمت خیال کیا اور پنشن کے مقدمے کے طے پانے کا انتظار کیے بغیر اس تحریر کو علی الاطلاق ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء پر ختم کر دیا:

"منشی امید سنگھ اندور والے، دلی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا (آگرہ میں) ...... بھائی! میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے ..... کیا کرتا، اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ منشی امید سنگھ، اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ، اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟"

(بنام میر مہدی مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

مجروح کے نام ایک خط مرقومہ ۸ر اگست ۱۸۵۸ء میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اِس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

"دستنبو" کے سلسلے کا پہلا مفصل خط تفتہ کے نام ہے۔ یہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کا ہے اور ان معنوں میں اہم ہے کہ اس سے "دستنبو" کے قلمی نسخہ کے کتابیاتی کوائف احاطۂ علم میں آتے ہیں اور کتاب کے انداز و اہتمامِ نگارش اور اشاعتِ کتاب کے بارے میں غالب کی توقعات اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے:

"اب ایک اور امر سنو: میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک

رویدادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال، نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام بدلے نہیں جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، نہ چھدرا، نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آ جائے یہاں کوئی مطبع نہیں ہے، سنتا ہوں کہ ایک ہے اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو، اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں۔ لیکن صاحب مطبع، اتنے پر کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پان سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین یا چار آنے قیمت پڑے، کاپی تو ایک ہی ہو گی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی، متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی، حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکلمہ کر دو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو —— ضرور! ضرور! ضرور!"

تفتہ نے کتاب کا مسودہ دیکھا نہیں تھا۔ غالب نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن کانٹے کی اس بات کی وضاحت رہ گئی کہ "رویدادِ شہر" کس کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے؟ یہ نئی عملداری کی تنقیص میں ہے؟ یا قلعۂ معلیٰ کی تائید میں؟ جس سے غالب کا تعلق ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالب، تفتہ کو لکھ چکے تھے کہ:

"مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

اور یہ باز پرس اور دار و گیر، افراد و اشخاص ہی سے خاص نہیں تھی۔ طباعتی ادارے اور اخبار بھی شدت اور دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ ۱۳ جون ۱۸۵۷ء کو اخبارات پر پابندی لگا دی گئی اور اخباروں کے اُن قواعد اور قوانین کو منسوخ کر کے جو ۱۸۳۵ء سے بلا کسی ضرورتِ ترمیم کے نافذ چلے آ رہے تھے اور جن کے نتیجے میں آغازِ نفاذ سے مئی ۱۸۵۷ء تک کے قریب بائیس برس کے طویل عرصے میں "اخباروں کے ایڈیٹروں اور حکومت کے افسروں میں تصادم کا کوئی قابلِ ذکر

واقعہ پیش نہ آیا[۱]" ایک نیا سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے پس پُشت گورنر جنرل کا یہ ذہن اور احساس کام کر رہا تھا کہ :

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے"۔
(گورنر جنرل لارڈ کیننگ، ۱۳ر جون ۱۸۵۷ء)

جیسا کہ محمد عتیق صدیقی نے لکھا ہے "دارالحکومت کلکتہ جو انگریزی اور دیسی اخباروں کا بھی بہت بڑا مرکز تھا اور جو دار و گیر کی دوڑ میں بھی کسی اور علاقے سے پیچھے نہ رہا تھا، وہاں کے متعلق پارلیمنٹری کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ :

"بہت سے ہندوستانی اڈیٹر اس ایکٹ (پریس ایکٹ) کی زد میں آئے۔ باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دوربین، سلطان الاخبار اور سماچار سدھا بھرشن کے طابع و ناشر پر سوپریم کورٹ میں مقدمات چلائے گئے۔۔۔۔ ایک اور اخبار "گلشن نو بہار" کا چھاپہ خانہ بحقِ سرکار ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا[۲]"۔

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس ضبط ہو رہے تھے اور اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے۔ اس پسِ منظر میں کسی ایسی کتاب کی طباعت و اشاعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو کمپنی بہادر کے حکام کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے مذکورہ خط میں اُستاد شاہ غالب نے تفتہ سے کہا کہ :

"میں نے۔۔۔۔ رودادِ شہر، یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔۔۔۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو"۔

تو منشی ہرگوپال تفتہ جو خود بھی غالب کے شاگرد تھے، تذبذب اور مشکل میں پڑ گئے ہوں

۱؎ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۵۸

2. Natarajan : History of Indian Journalism, p. 68 also : Barns : Indian Empire, p. 257

(بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی، ایضاً، صفحہ ۴۰۳)

تو عجب نہیں کہ یہ روداد، انگریز عملداری کی تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عاید پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت اشاعت کے لئے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ غالباً تفتہ نے اس نوع کے اندیشوں کا اظہار کیا تو جواباً غالب نے انہیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور لکھا کہ:

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں، اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نظر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے، جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی؟ اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا؟"

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد، تفتہ کے خدشات جاتے رہے اور کتاب کا مسودہ انہوں نے طباعت کے لئے مطبع مفید خلائق، آگرہ کے مالک و مہتمم منشی شیونرائن آرام کے سپرد کر دیا:

"صاحب! عجب تماشا ہے تمہارے کہے سے منشی شیونرائن صاحب کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور انہوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا آخر تمہیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا۔ تم نے مجھ کو، اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا؟ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو، کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔"

یہ محض وہم تھا تفتہ الگ نہیں ہوئے۔ وہ کتاب کی طباعت سے تاآخر وابستہ رہے اور کتاب اُن کی نگرانی میں چھپی۔ کتاب کے مندرجات اور "اندازِ تحریر" سے تفتہ کے اطمینان کے باصف، صاحبِ مطبع نے چھاپنے سے پہلے احتیاطاً مسودۂ کتاب آگرے کے حکام کو بھی دکھا لیا اور کتاب حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد ان کی اجازت سے چھپنا شروع ہوئی:

"صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ، چھاپنا شروع کیا، آگرہ کے حُکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔" (مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اس سے پہلے، ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو کتاب کا نام تجویز کر لینے کی اطلاع دے چکے ہیں:

"کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔"

انور الدولہ شفق کے نام اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے گیارہویں مئی، ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر سے چار جزو کی کتاب آگرے کو مطبع مفید خلائق میں چھپنے کو گئی ہے "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے"۔

مجروح کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء سے معاملت کی بعض اور جزئی تفصیلات سامنے آتی ہیں:

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آنے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا، آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے .... پانسو جلد چھاپی جاتی ہے"۔

کتاب والیٔ اندور کے اتالیق، رائے امید سنگھ کی، ان معنوں میں مالی اعانت سے چھپ رہی تھی کہ وہ پچاس جلدوں کے پیشگی خریدار ہوئے تھے جن میں سے چالیس انہوں نے غالب کو ہدیتہً دے دینا تجویز کیا تھا۔ رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے تفتہ کو ہدایت کی ہے کہ:

"تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا، اُن کو (دستنبو) پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کر دیں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب اُن کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا"۔

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے، عیاذاً باللہ! میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے"۔

۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام منشی شیو نرائن میں بھی ان رائے صاحب کا ذکرِ خیر آیا ہے:

"ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں۔ واسطے خدا کے مرزا تفتہ سے کہیے کہ اُن کو ملیں،

یعنی امید سنگھ بہادر اندور والے، وہ چھلی اینٹ میں پولیس کے پچھواڑے رہتے ہیں۔"
تفتہ رائے صاحب سے مل لیے اور کار براری میں کامیاب ہوئے:

"رائے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔" (تفتہ، ۳ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

۳۱ر اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی شیو نرائن آرام کو کتاب کی تزئین اور تصحیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جزو یا چار جزو کی ہو۔ چھ جزو سے کم نہ ہو مسطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف سے بڑا رہے۔ شیرازہ کی طرف کا کم ہو۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامہ کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیئے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیئے گا تو وہ بھی شریک رہیں اور مرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیورام پوری" ہو، خیر، مگر سفید اور مہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ کہ حاشیہ پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرز تحریر اور تقسیم، دل پسند اور نظر فریب ہو، حاشیہ کا قلم، بہ نسبت متن کے قلم کے، خفی ہو۔۔۔"

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو، کتاب، مطبع میں حوالے کر دی اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزرا۔ سینکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔"

"جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز" تفتہ کو ارشاد ہوتا ہے:

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آ پڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ ـــــ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ عبارت دو جز دیں آجائے میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جز دیں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو، لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔"

تصحیح پر زور اس وجہ سے تھا کہ "عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔" اور تزئین کی فکر اس لیے تھی کہ کتاب کو حکام عالی مقام کی نظر گزارنا تھا:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو وہ عبارت نری خرافات ہے۔ یارے یہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی، سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے۔ اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر، بہرحال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ ان چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جاوے، آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبداللطیف اور منشی شیو نرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور یہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جائے کہ کیا کیا جائے۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"خلاصہ یہ کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی۔ ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک آقائے قدیم لارڈ الن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔"

(منشی شیو نرائن آرام، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

آرام کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک غالب کو یہ علم نہیں تھا کہ "چھاپہ شروع ہو گیا یا نہیں؟ اور اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب؟" اس کے دو تین روز بعد غالب کے پاس تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ غالب نے ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تقطیع، شمار سطور، کاپی کے حسنِ ضبط، صحت الفاظ، عرض، قلم، خط، طرزِ تصحیح اور جدول وغیرہ پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے اور کاغذ، کاپی کی سیاہی اور رنگت نیز جلدوں کی تزئین اور آرائش کے باب میں ضروری ہدایات دی ہیں:

"تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے ہیں۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں، ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح، سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن ضبط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند، صحت الفاظ کا کیا کہنا ہے واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخے میں

سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اُس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہو گی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیورام پوری" پر اور چاہے نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلفِ محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں، اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ، زائد پڑتا ہو تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔"

لیکن خاص جلدیں جو حکام کی نذر کرنا تھیں، ایک مرحلے پر چھ کے بجائے سات ہو گئیں، ان کی تفصیل اور مرسل الیہ کے اسمار کی تفصیل مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء سے معلوم ہوتی ہے:

"رات، ایک بات اور خیال میں آئی ہے لیکن چونکہ تحکم و کار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی، ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ ان کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد، پھر یہ سمجھا چاہیئے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی، یہ میری کیا بد دمنی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انہیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد، اُن کی نذر بہت ضروری ہے آپ گنجائش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوالیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔"

کتاب کی تزئین و طباعت کی اطلاع ملی تو اشتیاقِ دید کو شاعرانہ اسلوب میں اس طرح بیان کیا:

"کتاب کا حُسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا۔۔۔، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر، یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق، آنکھوں کو کب تک ملے گا؟"

(بنام: تفتہ، ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

سات طلائی لوح کی پر تکلف جلدوں کے علاوہ جو حکام عالی مقام کو نذر جانا تھیں۔ ایک مزید خاص نسخے کی فرمائش، خاص اپنے لیے صاحب مطبع، منشی شیونرائن سے کی گئی۔ جنہیں ۱۹ اکتوبر کے خط میں لکھ چکے ہیں کہ "برخوردار منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔"

"دو جلدیں پر تکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اُس کے کم پر تکلف، میرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں۔ وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں، تم ایک جلد، بس۔ زیادہ صرف کیوں کرو؟ اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمہاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال، اپنے خاندان اور تمہارے خاندان کا اور باہم پل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں، مکرر کیا لکھوں؟"

(شیونرائن آرام، ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا اندازہ یہ تھا کہ کتاب کی طباعت اکتوبر میں انجام پا جائے گی:

"پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ("دستنبو" کا) ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے" (مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء تک انہیں کتاب کے چھاپے کے خاتمے کی اطلاع نہیں ملی تھی:

"اب چھاپا تمام ہو گیا ہوگا وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی۔ مگر وہ چالیس سرسری جو مجھے چاہییں ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو، اور ہاں میری جان یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیوں کر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہوگا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ...... اُن کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید آگرہ اور دلی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔"

(بنام: شیونرائن آرام، ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب کا چھاپا تمام ہو چکا، اب بے تابی سے اُن کا انتظار ہے تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں:

"صاحب! کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہولی۔ اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں یہ میں نہیں سمجھا کہ میرزا مہر کی بنوائی ہوئی سات کتابیں بھی انہیں کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جداگانہ روانہ کریں گے؟ وہ تم نے اپنی بنی ہوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے سے یہ بات تراوش کرتی تھی کہ سادہ کتابیں پہلے روانہ ہوں گی اور وہ ایک کتاب ہفتے کے بعد سو وہ ہفتہ بھی گزر گیا۔ یقین

ہے کہ اب وہ سب یکجا پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں۔"

(بنام: شیو نرائن، ۹ نومبر ۱۸۵۸ء)

"مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور رہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو، خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں، تا خاص و عام کو جابجا بھیجی جائیں۔"

(بنام: حاتم علی بیگ مہر، نومبر ۱۸۵۸ء)

کتاب بالآخر چھپ گئی اور غالب کے حصۂ رسد کی چالیس کتابوں میں سے تینتیس انہیں ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو مل گئیں، بے حد خوش ہوئے اور تفتہ کو لکھا:

"کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ نومبر کی، تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع سیاہی، چھاپا سب خوب، دل خوش ہوا، اور شیو نرائن کو دعا دی۔"

لیکن اُن کا جی، اُن سات کتابوں میں گڑا ہوا تھا، جن کا طلائی کام اور انگریزی جلد کے ساتھ تیار ہونا مقصود تھا۔ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! تینتیس کتابیں، بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے کہ مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسر ہو۔ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیوں کر ہو، ہاں! صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلاد نہ بن جائے، یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔ اور ہاں حضرت! کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجیے گا کہ یہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔"

(خطوط غالب، مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۲۰۲)

خاص جلدیں ابھی پہنچی نہیں ہیں کہ کتاب کے سادہ نسخے تقسیم بھی ہو گئے۔ خاص نسخوں کی پل پل راہ تکی جا رہی ہے:

"صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم بھی ہوگئیں۔ سات کتابیں میرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیونرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیونرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔"

(بنام: تفتہ، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"دیکھیے مرزا مہر (کتابیں) کب روانہ کرتے ہیں۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آپہنچیں، آج نہ آئیں، کل آئیں۔ کل سے میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔"

(بنام: شیونرائن، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو وہ سات خاص مجلد بھی غالب کو مل گئے، منشی شیونرائن کو مطلع کیا:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے، واقعی جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اُسی روپ کی ہیں۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے۔ آفتاب کی سی نمائش ہے۔"

مہر کو، ان جلدوں کی تزئین اور آرائش پر بہت ہی کھلے دل سے داد دیتے ہوئے لکھا کہ:

"کل جو جمعہ، روز مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے، نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد، وقت شام:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب، بر محل پہنچا

آدمی کو موافق اُس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سا رنگ دکھلائے۔"

ایک جگہ سے کتاب کی رسید آئی، ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہیں نیز یہ کہ کچھ حکام کو کتاب بھیج چکے اور کچھ اعلیٰ حکام کی نذر کے پارسل آج روانہ ہوں گے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری، اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط، مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے، میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سیکرٹریوں کی نذر، یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے، دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے بر دھد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام منشی غلام غوث بے خبر سے پتہ چلتا ہے، کہ صدائے برنخواست:

"پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بقلم چیف سکرتر بہادر، اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں: ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔"

اگلے روز، بے خبر ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

"پیشگاہ گورنمنٹ میں بتوسط چیف سکرتر بہادر سابق اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کئے ہیں۔ ایک نذر گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضور شہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ رد و قبول، نفرین و آفرین، کچھ بھی نہیں۔"

جہاں تہاں سے کتاب کی رسیدیں آنے لگیں اور غالب کے لئے یک گونہ خوشی اور خوش نفسی کا سامان فراہم کرنے لگیں:

"مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الٰہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات، کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنشن کے بھی ملنے کا حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔"

(بنام: مجروح، ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہوگئی ہے۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ "دستنبو" بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول، صدقِ ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آگئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب، اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا، اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر، مجھ کو آگیا۔ پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۵۹ء)

"صاحب! بندہ نے "دستنبو"، جناب اشرف الامراء جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر، لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی، سو اُن کا فارسی خط محررہ دہم مارچ، مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوشنودی، بطریقِ ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لیفٹیننٹ گورنر کی قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی، بسبیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر، دہلی بھیجا گیا تھا کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر، دہلی آگیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔"

(بنام: مہر، مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء)

"اسباب توقع" فراہم ہونے لگے لیکن "دستنبو" کی غایتِ تصنیف معمولی پنشن کی واگزاشت ہی نہیں تھی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ انگلستان سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کے بھی اُمیدوار تھے، جس

کے لئے وہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے زمین ہموار کر چکے تھے اور ان کی گزارشات پر ضروری کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قلعہ معلیٰ سے تعلق کے بعد غالب کے:

"۵، ۶ برس آرام سے گزرے۔ پنشن کے: سات سو پچاس روپے سالانہ، بادشاہ سے، چھ سو روپے سالانہ، شہزادہ ولی عہد میرزا فخرو، اُن کے شاگرد ہو گئے تھے، اُن سے چار سو روپے سالانہ ۱۸۵۴ء کے آخر آخر غالب، اس کی بھی سبیل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں اودھ کے علم دوست اور فنکار بادشاہ واجد علی شاہ سے بندھی ہوئی رقم مل جایا کرے۔ چنانچہ وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔ اِدھر اُدھر کی ریاستوں اور قدردان امیروں کی طرف سے بھی "فتوح"، پہنچ جایا کرتی تھی لیکن یہ سب کچّے ٹھکانے تھے اور غالب کو جو درباروں کے رازداں اور بدلتے ہوئے حالات کے نبّاض تھے، آگے کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اس تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے ساتھ اپنے مستقبل کی حیثیت کا پکّا بندوبست کر لینا چاہتے تھے اور اس کی خاطر انگریزی اقتدار کا خوش رکھنا اور گورنر جنرل کے دفتر میں مقام بنانا ضروری تھا۔"[1]

"۱۸۵۶ء کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی اقتدار سے خود کو منوانے کی کوشش سنجیدہ ہو گئیں اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں پُرزور قصیدہ لکھ کر لندن بھیجا جس کا سارا زور حاجت روائی پر تھا اور ساتھ میں ایک عرضی بھی تھی کہ بادشاہوں کی شاعرنوازی کے چلن کے مطابق مجھے بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جائے۔ اس قصیدے اور عرضی کی رسید اُن کو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن سے مل گئی تھی اور نہ جانے کیسی کیسی امیدیں بندھ گئی تھیں کہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے خلاف سُلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔"[2]

"دستنبو" میں اس کی تفصیل درج کرنے کے بعد، غالب نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ:

"اگر ہندوستان کا نظم ونسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں، عدالتیں نہ اُجڑتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا، جس سے (خطاب، خلعت اور پنسن کی میری) مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔"

"دستنبو" کے خاتمے کی عبارت سے بھی غرض تصنیف پر روشنی پڑتی ہے:

---

[1]، [2] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۹۶

"کاش! میری ان تین خواہشوں یعنی: خطاب، خلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے۔ جن کے متعلق، میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے ——— اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک خط مورخہ ۱۳؍جنوری ۱۸۵۹ء سے "دستنبو" کی غرض تصنیف بالکل آئینہ ہو جاتی ہے:

"۱۷؍دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ (کیننگ) سائل نے بھیجا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے یہ حکم مؤرخہ ۱۷؍دسمبر ۱۸۵۶ء، آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے (مشمولہ دستنبو) کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل، حکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

لیکن یہ "یاد دہی" نہ دو اثر جدید ہی اور نئے انعام اور اعزاز کا تو کیا مذکور، اشاعتِ کتاب کے ایک سال بعد تک غالب کو دستورِ قدیم کی بحالی کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا:

"مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔"

(بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، ۷؍نومبر ۱۸۵۹ء)

اور پھر خدا خدا کر کے پنشن مقررہ مئی ۱۸۶۰ء میں کھل گئی۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یکمشت پایا اور مارچ ۱۸۶۳ء میں پچھلے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم بھی آگیا لیکن ملکہ انگلستان کے ہاں سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کی تجویز و تحریک جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو ایک اور سوجھی، ۱۲؍ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مہر کو لکھتے ہیں:

لے تقریباً بظاہر "دستنبو" ہی پنشن کے اجراء کا باعث ہوئی۔ رجوع کیجیے خط بنام میر مہدی مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء

"ہاں صاحب! ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے "تہنیت فتح ہند اور عملداری شاہی" ساٹھ بیت کا ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذِ مُذہّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے، یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیونرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے پہلے کتاب کے، دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو، اور پہلے صفحہ پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلداللہ ملکہا" (کذا) میرا نام کچھ ضرور نہیں، کتاب کے صفحے پر تو ہوگا۔ اس مطلب خاص کا جواب باصواب یعنی نویدِ قبول جلد لکھیے۔"

دوسرے دن منشی نبی بخش حقیر کو اسی مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"بھائی جان! میں نے ایک قصیدہ جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں، چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر "دستنبو" سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت، اور قصیدے کو کتاب کے سبب شہرت ہو جائے گی۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔"

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط موسومہ حاتم علی بیگ مہر میں لکھتے ہیں:

"قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضروری ہے، پر دیکھا چاہیے کہ صاحبِ مطبع کو کیا منظور ہے اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے ہے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔"

لیکن صاحبِ مطبع کی "منظوری" آ گئی، ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا:

"صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے، خدا اُن کو سلامت رکھے۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ اس قصیدے کو، کتاب کا دیباچہ کیوں نہ بنا دیا جائے؟ لیکن یہ کتاب کے اِدّعائے تحریر کے منافی تھا۔ کتاب کی نثر و نظم، فارسی قدیم میں تھی، یعنی بے آمیزشِ لفظِ عربی، اور قصیدہ فارسیٔ متعارفہ و مُروجہ میں تھا۔ غالب نے ان دونوں کے اجماع کی یہ صورت نکالی:

"قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا، از راہِ اکرام و اعزاز ہے، ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سررشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔"

(بنام: تفتہ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

یہ "قصیدۂ برگزیدہ" "دستنبو" طبع اوّل میں چھ صفحوں پر مشتمل ہے اور سرورق کے بعد آغازِ کتاب میں شامل ہے اور اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کا شمار ہوتا ہے۔

"دستنبو" طبع اوّل کے بیلدار سرورق کی سات سطری عبارت یہ ہے:

(سطر: ۱) العلمہ طاقۃٌ

(سطر: ۲) کتاب مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی

(سطر: ۳) تصنیف فردوسی ہند نواب اسداللہ خاں بہادر غالب تخلص دہلوی موسوم بہ

(سطر: ۴) دستنبو

(سطر: ۵) جس میں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدای ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک

(سطر: ۶) لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بزبانِ فارسی متعارفہ مروجہ ہے

(سطر: ۷) مطبع مفید خلایق آگرہ میں واسطے افادہ خاص و عام کے بہ اہتمام شیونرائن کے چھاپی گئی

سرورق کی پہلی سطر "العلمہ طاقۃٌ" پر مشتمل ہے۔ یہ نسبتاً جلی قلم سے ہے اور صاحبِ مطبع، منشی شیونرائن آرام کی اپج ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب انہیں لکھتے ہیں: "العلمہ طاقۃٌ[۱] شوق سے لکھو" اس کے علاوہ سرورق کی ساری عبارت جسے سات سطروں میں تقسیم کیا گیا ہے، غالب کی اپنی ترتیب اور ہدایت کے مطابق ہے۔ اس کا ابتدائی مسودہ آگرہ میں تیار ہوا تھا جس میں غالباً انگریزوں کی فتح کے مفصّل حالات کی طرف بھی اشارہ تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمونِ کتاب قرار دیتے ہوئے آرام کو لکھا کہ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی اور مطبع پر بات آتی:

---

[۱] "العلمہ" کی جگہ "العلم" چاہیے تھا، مگر مطبع مفید خلایق کی چھپی ہوئی "دستنبو" کی لوح پر بھی العلمہ طاقۃٌ ہی چھپا ہوا ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص: ۴۲۵)

"صفحے کے آخر[1] کی دو سطریں ازروئے مضمون سراسر کتاب کے مضمون کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے سو ابتدائے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا، اس کا بھی بیان ضمناً آگیا۔ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو۔ پہلے سوچو کہ تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام۔ کیوں میاں، تقسیم یوں ہی ہے؟ اب میں دوسرے صفحے پر ساتوں[2] سطریں لکھ دیتا ہوں، اس کو ملاحظہ کرو، اور میرا کہا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہوجائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے آرام کو لکھا کہ:

"دستنبو" کے آغاز کی عبارت ازروئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی اور چھاپی گئی ہوگی۔"

سرورق کی تقسیم غالب کی ہدایت کے عین مطابق ہے۔ یعنی تین سطریں اوپر، تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے "۱۱ مئی" کا ٹکڑا سرورق کی مطبوعہ عبارت سے محذوف ہے جس کی وجہ سے کتاب کی حقیقت کسی قدر غلط ہوگئی۔

"دستنبو" (طبع اول) کے سرورق پر مصنف کا نام "نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب" درج ہے یہ غالب کی اپنی پسند اور ہدایت کے مطابق ہے۔ صاحبِ مطبع منشی شیو نرائن نے ایک خط کے لفافے پر "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تھا۔ غالب اس سے بددل ہوئے اور یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھا کہ:

"صاحبِ مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: "مرزا نوشہ صاحب غالب"۔ اللہ غور کرو یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان، یا اردو، یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز

۱؎ سہواً "اردوئے معلیٰ" میں "آخر کے صفحے" چھپا ہے۔ یہ غالب کا سہوِ قلم ہے یا کاتب کی لغزش، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ غلطی "اردوئے معلیٰ" کی پہلی طباعت سے اب تک چلی آرہی ہے۔

۲؎ فاضل لکھنوی کو ان سات سطروں کے ضمن میں صریح التباس ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اردوئے معلیٰ، مجلس ترقی ادب لاہور، صدی ایڈیشن، ص ۴۷۱

چھاپے کی، یہ کوئی کتاب، اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام دیکھ لیتے، تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت، عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے۔ مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرار کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا! میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی!"

سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو بتاکید لکھتے ہیں کہ:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا مناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر" کا، اور "بہادر" کے بعد تخلص "اسد اللہ خان بہادر غالب"۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ آیا کتاب پر نام محمد اسد اللہ خان لکھا جائے؟ نیز "مرزا" و "مولانا" و "نواب" سا سے کیا لکھا جائے؟ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کو جواباً لکھتے ہیں کہ:

"سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا، میم، دال (محمدؐ)، اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خان" نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو لکھو۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ "نام میرا، جس طرح چاہو لکھ دو۔" لیکن اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں خود شیو نرائن کو بڑی ملائمت سے سمجھاتے ہیں کہ:

"سنو، میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے اُمرا، سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر "نواب اسد اللہ خان" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خاں" لکھو۔ یا "میرزا اسد اللہ خان" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

"دستنبو" (طبع اول) کا متن صفحہ ۷۹ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر میں "تمام شد" کے الفاظ کے بعد یہ جملہ ثبت ہے:

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں، فقط۔"

یہ اَمر بھی خطوں میں زیرِ غور رہا ہے۔ تفتہ کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"اَوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے، مگر اُس کی عبارت کیا بتاؤں؟ صاحبِ مطبع اس اَمر کو اُردو میں آخر کتاب پر لکھ دیں ـــــ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔"

اس کے بعد ایک دوسرے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"بھائی تم نے بھی اور منشی شیونرائن صاحب نے بھی لکھا۔ میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو:

"نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلایق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔"

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیونرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔"

چنانچہ غالب کی "میں" زدہ عبارت کے بجائے "مہتمم مفید خلائق" کی جانب سے ممانعت کا وہ مختصر اور مؤثر جملہ چھاپا گیا، جو اُوپر نقل ہُوا ہے۔

"دستنبو" (طبع اوّل) میں آخری صفحے ۸۰ پر دو قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ایک آغازِ کتاب کا، اور دوسرا انجامِ کتاب کا:

۱۔ قطعۂ تاریخ

آغاز کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مہر تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ

اسداللہ خان غالب مہر — جُنذا زد رقم چہ دستنبو

نامہ خود سال خویش داد نشان — ید بیضا ستم چہ دستنبو

۱۸۵۷ء

۲۔ قطعۂ تاریخ

انجام کتاب از میرزا تفتہ سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی زد رقم غالب کہ آنرا — بجان و دل جہانی گشت طالب

نوشتم تفتہ سال اختتامش — بیا بنگر چہ دستنبوی غالب

۱۸۵۸ء

ان قطعات کا ذکر بھی خطوں میں موجود ہے۔ میرزا مہر کو ان لفظوں میں قطعۂ تاریخ پر داد اور اصلاح دی ہے:

"بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم بےکسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے! آفرین! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے:

نامہ خود سال خویش دار نشان"

"دستنبو" کے مطبوعہ قطعہ تاریخ میں مصرع کی یہی روایت چھپی ہے۔ میرزا مہر کو مادۂ تاریخ کے سقیم ہونے کے بارے میں کچھ وہم رہا ہوگا۔ قطعہ موزوں کرنے سے پہلے انہوں نے اس بارے میں غالباً ایک دوبار استفسار کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انہیں لکھتے ہیں:

"مادۂ تاریخ میں کیا برائی ہے جو تمہارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے باربار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے، قطعہ لکھو اور خاتمہ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب (تفتہ) کا، ایک قطعہ تمہارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی (نبی بخش حقیر) کی طرف ہے مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیئے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیئے۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو بھی لکھا ہے کہ:

"بھائی میرزا تفتہ! ایک قطعہ میرزا صاحب (حاتم علی بیگ مہر) کا، ایک قطعہ تمہارا، بلکہ ایک حقیر سے بھی لکھواؤ۔"

لیکن حقیر کا کوئی قطعہ "دستنبو" میں شامل اشاعت نہیں۔ اس طرح ان کا نام تو جیسا کہ غالب چاہتے تھے، کتاب میں نہیں آسکا۔ لیکن اس کتاب کے سلسلے میں ان کا نام، ان معنی میں ناگزیر ہے کہ کتاب کی کاپیاں پڑھنے، تصحیح کرنے اور غلطیاں بنانے کی سراسر ذمہ داری، ان ہی کی رہی۔

"کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیئے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیئے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے۔"

(بنام شیو نرائن، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

"صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے یہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔"

(بنام حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی (نبی بخش حقیر صاحب) کا ہو گیا ہے۔ جلدوں کی آرائشگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری ان کی، میرے کس دن کام آئے گی۔"

(بنام ہرگوپال تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی نبی بخش صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضروری نہیں۔ مجھ پر مہربان اور حسن کلام کے قدردان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح (رسوائی) کے روادار ہوں گے؟"

(بنام تفتہ، مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے، واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصلی نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے خدا کرے انجام تک یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔"

(بنام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی صاحب (منشی نبی بخش حقیر) کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے۔ آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔"

(بنام تفتہ، ۱۶ ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غرض یہ کہ کاپی کی تصحیح کا ذمہ منشی نبی بخش حقیر کا تھا اور وہ اس میں پورے اترے کہ "دستنبو" غلط نامے کی حاجت سے بے نیاز رہی۔ گو دو تین غلطیاں

پھر بھی رہ گیئں[۱]" اور یہ کوئی ایسی بات نہیں اس لئے کہ مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں :

" ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل کر لیا جائے[۲]"

غالب نے "دستنبو" کو بزبانِ فارسیٔ قدیم لکھنے کا اِدّعا کیا ہے، یعنی التزام یہ رکھنا چاہا ہے کہ تمام کی تمام عبارت خواہی نظم ہو، خواہی نثر جو متنِ کتاب میں آئے بے آمیزش لفظِ عربی ہو۔ "دستنبو" طبع اوّل کے سرورق پر اپنے اس کمالِ فن کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

"کتابِ مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم، بے آمیزشِ لفظِ عربی"

کتاب کی اشاعت سے پہلے مختلف خطوں میں، فارسیٔ قدیم کی خود اختیاری قید کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے :

" فارسی، بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں، تا بہ ہندوستان چہ رسد ؟"

(بنام : نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

" التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(بنام : منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے گیارہویں مئی، ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

(بنام : انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپ جانے کے بعد لکھتے ہیں :

۱۔ نامۂ غالب بنام شیونرائن، مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء

۲۔ نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۱۴

"بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا ہے کہ بزبانِ فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمار کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔"
(بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آوے۔"
(بنام: یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو احساس ہوا کہ وہ ایک عربی لفظ "نہیب" استعمال کر گئے ہیں۔ یہ اُن کے اِدّعائے تحریر کے منافی تھا۔ چنانچہ اُنہیں صبر کہاں، وہ بے چین ہو گئے:

"ایک اور کام، آپ کو کرنا چاہیئے کہ شاید تیسرے صفحے کے آخر میں یا چوتھے صفحے کے اوّل میں یہ فقرہ ہے، اگر در دم دیگر بہ نہیب میاکش بہم زند۔ "نہیب" کا لفظ عربی ہے۔ یہ سہو سے لکھا گیا ہے۔ اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے میاکش" بنا دیجئے گا۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔"
(بنام: شیونرائن، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بہت ضروری یہ اُمر ہے اور میں منشی شیونرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے: اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند، "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا: "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ "نہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر یہ رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔"
(بنام: تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہوگا؟"
(بنام: تفتہ مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"آنکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید بشوپدید آورد، اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ" اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی: "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ ضرور، ضرور، اور اس کا انتظار

نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میرا امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔"
(بنام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

اس واویلے کے باوجود معلوم ہوا کہ "نہیب" کی درستی نہیں ہو سکتی۔ وہ حصہ کتاب جس میں یہ لفظ آیا ہے، چھپ چکا۔ اس پر اپنی تہید ستی کے باوجود غالب نے بہت حساس ہونے کا ثبوت دیا:

"اچھا میرا بھائی! "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ، عربی ہے۔ ہر چند مسودے میں بنا دیا تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اس کی درستی کی خبر بھیجو۔"
(بنام تفتہ، ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ بالآخر اس غلطی کی درستی ہو گئی:

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزاء کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے (یعنی غالب) فارسی کا عالم ہے، علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق، ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔"
(بنام تفتہ، ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

لیکن اس اہتمام و کاوش، حزم و احتیاط اور "نفس مطمئنہ" کے باوجود وہ اس التزام میں تمام و کمال پورا نہیں اتر سکے کہ "بزبانِ فارسئ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے۔ اس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے" "نہیب" کی ہر قیمت پر انہوں نے صحت کر دی تھی، — بایں ہمہ بعض لغات ان کی نظر سے رہ گئے۔ جن سے سید جمیل الدین نے اپنے ایک فاضلانہ مقالے میں جو "دستنبو کا ایک خاص نسخہ" کے زیر عنوان

سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی کی چار اشاعتوں[۱] میں قسط وار چھپا ہے، بہت اچھی بحث کی ہے ان میں سے کچھ عربی کلمات مثلاً ماتم، زمزمہ، شرر، صاحب، قلعہ، کیسہ، غوغا، خنجر کی مثال دی جاسکتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے بقول:

"ان میں سے بعض الفاظ بظاہر فارسی کے ہیں۔ یہاں تک کہ لفظ "خنجر" کے بارے میں تو رضا قلی ہدایت کو لکھنا بھی پڑا کہ اگرچہ در اشعار پارسی بسی مشہور است اما عربیست و دشنہ، پارسی آنست[۲]" مگر ان سب کی اصل عربی ہے۔ بہر حال ان چند مستثنیات کے سوا کتاب کی زبان وہ ہے۔ جسے میرزا غالب نے خالص فارسی سمجھا ہے اور جس کے لکھنے میں انہوں نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔"

(مقدمہ: دستنبو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۸، ۲۹)

کاوش ہی سے کام نہیں لیا، اس پر جابجا، یا بے جا فخر بھی کیا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جواب بھیجا ہے۔ اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسیِ قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔"

(بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، نومبر ۱۸۵۸ء)

اس عبارت کا خط کشیدہ ٹکڑا، رکنے پر مجبور کرتا ہے اور معنویت سے بھرپور ہے۔ "ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ" رکھا گیا، تب ہی یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے تازہ عائد سخت پریس ایکٹ کی موجودگی میں حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد چھپ سکی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع، نامطبوع نہیں ہوا۔ انگریز حکام نے "بہ کمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ اس کا طرزِ تحریر یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" میں غالب بقول شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کی قلم سے اسے لکھا ہے۔

۱؎ (الف) جلد ۶ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۲۱
(ب) جلد ۶ شمارہ ۲، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۳۷
(ج) جلد ۶ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۵۱
(د) جلد ۷ شمارہ ۴، جولائی اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۱

۲؎ فرہنگ انجمن آرائی ناصری، تہران، ۱۲۸۸ھ

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان فارسیٔ قدیم میں پیش کرنا بھی حکمت سے خالی نہیں تھا۔ یہ مصلحتوں کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس روزنامچے کو دساتیر کی بناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار و استشہاد یعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انہیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پرانے نظام کا حامی اور نئی عملداری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہیں تھے۔ بہادر شاہ کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِ مقابل آگئی تھیں (۱۸۵۷ء میں) بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں۔[1]"

شاہ کے مقابلے میں، فرنگیوں کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں، گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے لئے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تحسین و تائید میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے غالب نے یہ سرگزشت متعارفہ اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسی قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لئے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی متعارفہ اور مروّجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی، ناآمیختہ بہ عربی میں یہ رُوداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و یگانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لئے کتاب

---

[1] خلیق احمد نظامی، مقدمہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۱

قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حکام کو تو جو اس کتاب کے مخاطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے، اس قفل کو کھلوانا ہی تھا۔ غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لئے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان میں معصوم رہیں اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکام نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی، پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی۔ عالی مقام حکام سے رہ و رسمِ مراسلت بدستور جاری ہو گئی اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی۔ قلعۂ معلیٰ سے تعلق کی صفائی ہو گئی۔ عذرِ بے گناہی مسموع ہوا۔ اِک گونہ سکون ہوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، پائی پائی مل گیا آئندہ کے لئے خرخشہ نہ رہا۔ پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔ غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "دستنبو" اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے یہ آسان نہیں۔ فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور یہ طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بیگانہ و ناآشنا ضرور ہے اس لئے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سَرسَری گزر سکتے ہیں۔

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بنام، مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مُرسل الیہ (لیفٹیننٹ گورنر صوبہ غرب و شمال) کے مطالعے میں ہے۔ قسمت کی اچھی ہے یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہو گا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے کہ وہ جو اس کی سَیر پر

مامور ہیں، ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپنے سے پہلے ہی آرام نے "دستنبو" کے بعض حصے غالباً ایلن براؤن کو سنائے تھے اور اس کا ذکر اپنے خط میں کیا۔[۱] اس پر غالب، ۳۱ راگست ۱۸۵۸ء کے خط میں آرام سے پوچھتے ہیں کہ:

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا، کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو ــــ مفصل لکھو۔"

اس کی تفصیل پہلے آچکی کہ اندور کے رائے امید سنگھ کی دل چسپی اور مالی اعانت سے "دستنبو" کا ڈول ڈلا ــــ مولانا غلام رسول مہر کے بقول[۲] "رائے امید سنگھ نے دہلی کالج میں تعلیم پائی پھر مہاراجہ ہلکر والیٔ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ہلکر نے عنانِ حکومت سنبھالی تو امید سنگھ کو مشیر الدولہ کا خطاب دیا۔" رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے، غالب نے تفتہ کو ہدایت کی تھی کہ:

"رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں (آگرہ میں) رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو اُن کا حکم ہو بجالانا، ان کو پڑھا بھی دینا۔"

(۲۸ راگست ۱۸۵۸ء)

چار روز بعد کے ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہوں گے۔ عیاذاً باللہ! میں، اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔"

(یکم ستمبر ۱۸۵۸ء)

مشیر الدولہ رائے امید سنگھ، نہ صرف یہ کہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے، بلکہ والیٔ اندور کے اتالیق بھی تھے لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی، غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۶

۲۔ ایضاً، صفحہ ۶۳

تھی، اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے۔

غالب نے تفتہ، مہر، آرام، حقیر اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل"[1] تشکیل دے دی تھی جو آگرہ میں کتاب کی طباعت واشاعت، کتابت، تصحیح، تصحیف، تزئین اور تجلید کے لئے سرگرم عمل تھی۔ ترتیب وکتابت اور اشاعت وطباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل" جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے سے معذور رہی۔ کتاب کے سرورق کی عبارت آگرہ میں تجویز ہوئی۔ اس کا مسودہ، آرام نے غالب کے ملاحظے اور مشورے کے لئے بھیجا، جس میں کتاب کو انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی حامل ظاہر کیا گیا تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمون کتاب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

"آخر..... کی..... سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر وسپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتدا ء ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ رجولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا، ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو..... میں دوسرے صفحے پر ساتوں سطریں لکھ دیتا ہوں اس کو ملاحظہ کرو، اور میرا کہنا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(بنام: شیونرائن آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب، دلی میں تھے اور کتاب آگرہ میں چھپ رہی تھی۔ نظر اور شہر سے دُور، آگرہ میں کتاب چھپنے کا باعث یہ تھا کہ دلی میں اُن دنوں طباعت وکتابت کا انتظام تسلی بخش رہا تھا اور نہ صحافی اور نقاشی کا:

"یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں، ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے، اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

(بنام: تفتہ، ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء)

"میرزا تم بڑے بے درد ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً، صفحہ ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو کیوں تکلیف دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔"

(بنام، تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز)

کتاب اپنی نظر اور اپنے شہر سے دُور چھپ رہی تھی، ایک قباحت —— پھر یہ کہ بوجوہ غالب کتاب کی خوبصورت، صحیح اور جلد تر اشاعت کے متمنی تھے اس ضمن میں "روز" ہی انہیں کوئی نہ کوئی فکر لاحق ہو جاتی تھی اور کسی نہ کسی تجویز، وضاحت اور ہدایت یا استفسار کی ضرورت پیش آجاتی تھی ۲۲ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب، حقیر کو لکھتے ہیں:

یہ ہم، تم اور میرزا تفتہ میں مراسلت، گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہو جاتا!"

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، غالب نے آگرہ میں جہاں کتاب زیر طبع تھی، میرزا ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" قائم کر دی تھی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق "دستنبو" کی تجویز (جولائی ۱۸۵۸ء) سے اس کی اشاعت (نومبر ۱۸۵۸ء) تک کی تہائی سال کی مُدت میں غالب نے "کونسل" کو چالیس پینتالیس خط لکھے، لیکن یقیناً اس سے بہت زیادہ، لیکن محفوظ اتنے ہی رہ سکے۔

اِس مراسلت ہر روزہ نے وہ مواد فراہم کر دیا جس نے آگے چل کر "عود ہندی" اور پھر "اُردوئے معلیٰ" کی خشت اول کا کام کیا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک جگہ، ایک حلقے میں غالب کے بہت سے خط جمع ہو گئے۔ غالب کا جی کتاب کی اشاعت میں گڑا ہوا تھا۔ اس لیے اشاعتِ کتاب کے سلسلے کے یہ خط بڑے پُرزور ہیں اور کھلے دل سے لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حق میں جو خفیتاً کم نام اصحاب تھے، غالب کی یہ تحریریں، سرٹیفیکیٹ کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی بڑی پونجی خیال کیا، انہیں احتیاط سے رکھا اور اس کی اشاعت کی طرف دھیان دیا۔ ان کی اشاعت میں مکتوب الیہم کو اپنی شہرت کا پہلو بھی دکھائی دیا ہو تو عجب نہیں۔ اس طرح کچھ ان خطوں کا حُسنِ ذاتی اور کچھ اپنے کو نامور بنانے کی شخصی اور فطری کمزوری، اس خیال کا باعث ہوئی کہ انہیں چھاپا جائے۔ چنانچہ جب نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں آرام "دستنبو" کی طباعت سے

فارغ ہوئے تو انہوں نے خطوطِ غالب چھاپنے کی فکر کی۔ غالب کے لئے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انہوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح لفظوں میں شیو نرائن آرام کو لکھا کہ:

"اُردو کے خطوط، جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رُقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خُلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

یہ ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء کا خط ہے۔ اُردو خطوں کی اشاعت کی، اِس تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی شیونرائن کے شریک تھے اور بضد تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں۔ ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ:

"رُقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"

اسی روز یعنی ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے شیونرائن کو لکھا کہ:

"رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔"

آرام اور تفتہ کی یہ تحریک و تجویز جسے ۱۸۵۸ء میں زائد بات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا۔ ٹھیک دس برس بعد ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر اُبھری اور اس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے لیکن جب بھی اس سلسلے کے آغاز کی جستجو کی جائے گی، بات "دستنبو" تک پہنچے گی۔ "دستنبو" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

منشی شیونرائن، کتاب باہتمام چھاپ تو رہے تھے لیکن کم و بیش ہر طابع کی طرح، انہیں یہ فکر بھی رہی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ کتاب پڑی ہی نہ رہ جائے۔ تفتہ نے اس طرف توجہ دلائی یا خود غالب کا دھیان اس طرف گیا۔ صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ سے پوچھتے ہیں:

"ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں؟"

اشتہار، اور اس کے مضمون کی طرف اشارہ شیو نرائن کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بھی ملتا ہے:

"دستنبو" کے آغاز (سرورق) کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہو گی، اور چھاپی گئی ہو گی اور آپ نے اسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہو گا یا چھاپیے گا۔"

غالب کے خطوں میں ایسا کوئی حوالہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ کتاب کا یہ مجوزہ اشتہار مطبع مفید خلایق آگرہ کے اخبار میں چھپایا نہیں، لیکن کتاب کے چھپ چکنے کے بعد غالب کے ایک خط بنام شیو نرائن کا یہ جملہ صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

"یہ صاحب لوگ، اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، تم سے بہ قیمت کوئی نہیں منگواتا۔"

(۴ جنوری ۱۸۵۹ء)

غالب کے ایک خط سے "دستنبو" کی نکاسی کے بارے میں کتاب کے طابع شیو نرائن کی ایک تجویز ہویدا ہے (جو ضروری نہیں کہ بر بنائے تشویش ہی ہو) کہ غالب ہنری اسٹورٹ ریڈ سے جو صوبہ غرب و شمال میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، "دستنبو" کی خریداری کی تحریک کریں۔ غالب نے جواباً لکھا کہ ریڈ صاحب نے مجھ سے اردو میں کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کر رکھی ہے وہ پوری ہو تو "دستنبو" کی خریداری کے لئے لکھوں۔ غالب کے خطوں کے لفظ یہ ہیں:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔"

(بنام شیو نرائن ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"ریڈ صاحب کے باب میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش کروں گا۔"

(بنام شیو نرائن، ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں "خریداری کی خواہش" سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ ریڈ، اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لئے "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لئے" ایک نسخہ

خریدیں! اُن کے ذاتی ملاحظے کے لئے تو شیونرائن اور غالب دونوں الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب تھے۔ اُن کے دنوں میں ایک ملاقات، میری اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے۔ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلایق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔"

(بنام تفتہ، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۸ء)

ظاہر ہے شیونرائن، کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، جائز طور پر اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ غالب نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انہیں لکھا کہ:

"ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو "دستنبو" کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الہ آباد سے تمہارے پاس حکم پہنچے۔"

شیونرائن کو "قرینے" کی جستجو ہوئی جو قدرتی بات تھی لیکن غالب سے بات بنائے نہیں بنی:

"میاں! کیا قرینہ بتاؤں، گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔"

(مرقومہ ۱۸ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

کوئی بات اگر "واقعی" تھی بھی تو اس کا "ظہور" بہرحال نہیں ہوا، اس لئے کہ شیونرائن کے نام غالب کا ایک خط مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء اس بات کا مظہر ہے کہ کتاب کا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۹ء میں سب کا سب نکل گیا اور اس میں غالب کی کسی کوشش کو دخل نہیں تھا۔

"کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے جس کسی کو دی ہو، دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم مجھ کو یہ بات ضرور ضرور لکھو۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آگئی ہوگی، یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی، پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

غالب کا قیاس صحیح نکلا۔ ۲۲ر اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں آرام کو لکھتے ہیں:

"دستنبو" کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔"

کتاب کا ایڈیشن ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء سے پہلے نکل گیا تھا لیکن پھر اس کا ایک نسخہ ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آگئی۔ آرام آگرہ سے دہلی آرہے تھے۔ چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے انہیں لکھا کہ:

"اگر 'دستنبو' باقی ہوں تو دو اپنے ساتھ لے آنا۔"

آرام کے نام ۱۷ اگست ۱۸۵۹ء، ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۹ء کے خطوں میں بھی کتاب "دستنبو" اور ولایت کے لئے انگریزی عرضی کا ذکر آیا ہے یہ دونوں چیزیں اُس وقت تک غالب کو فراہم نہیں ہوئی تھیں اور اگلے برس غالباً وسط جنوری تک یہ کہیں اُنہیں مل سکیں، اس لئے کہ ۳ مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو غالب نے رامپور کے دورانِ قیام میں آرام کو لکھا ہے کتاب اور عرضی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

"کتاب اور عرضی اواسط ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔"

اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو رامپور سے دہلی لوٹ آنے کے بعد آرام کو لکھا گیا ہے غالب کہتے ہیں:

"۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رامپور گیا ہوں۔"

گویا ولایت بھیجنے کے لئے "دستنبو" کے ایک نسخے کی فراہمی کی جو فرمائش غالب نے جولائی ۱۸۵۹ء میں کی تھی، آرام، اُسے چھ ماہ کے بعد پورا کر سکے۔ تاخیر بظاہر اسی بنا پر واقع ہوئی ہوگی کہ کتاب آرام کو تلاشِ بسیار کے باوجود، اس درمیان میں نہ مل سکی ہوگی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن جو نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔ اشاعت کے قریب آٹھ نو ماہ کے اندر اندر سب کا سب نکل گیا تھا اور اسی زمانے میں اس کا ہاتھ آنا آسان نہیں رہا تھا۔

○

"دستنبو" میں غالب نے انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے لئے عذر وضع کئے ہیں اور ان مظالم کے لئے جواز پیدا کر کے انہیں بے اثر اور پردہ پوش کرنے کی کوشش کی ہے:

"غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔"

"یہ جو گھر بار اور جان و مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہار اطاعت کرے، اُس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے اُن کو قتل کر دیا گیا۔"

غالب نے ایک طرف تو انگریزوں کی سختیوں کو امرِ معمولی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان کے لئے سپر فراہم کرنے اور پناہ گاہیں تراشنے میں بھی مستعدی دکھائی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ غالب نے انگریز سپاہیوں کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا ہے اور ان کی معقولیت اور امن پسندی کے گُن گائے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں۔"

"(انگریز سپاہی) عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا، پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔"

"انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

غالب کے یہ بیانات صریحاً انگریزوں کی تائید میں ہیں لیکن خود غیر جانبدار انگریز مؤرخین کی شہادتیں اس کے برعکس ہیں۔ دلی کے شہریوں پر انگریز سپاہیوں کے جاں سوز مظالم کے بارے میں لارڈ الفنسٹن، سر جان لارنس کو لکھتے ہیں کہ:

"(دہلی کے) محاصرے کے ختم ہونے کے بعد سے ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں، انہیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ بغیر دوست یا دشمن میں تمیز کیے، یہ لوگ سب سے یک سا بدلہ لے رہے ہیں۔ لوٹ میں تو حقیقت میں ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے۔"

[Life of Lord Lawrance, by : Baswarth Smith, vol. II p. 262]

پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ:

"محاصرے کے دنوں میں قلعے کے چھتے میں بیمار اور زخمی سپاہیوں کا ایک اسپتال تھا۔ کمپنی کی فوج جس وقت قلعے کے اندر گھسی، جتنے زخمی اور بیمار اسپتال کے اندر دکھائی دیے، اُن سب کو، اُن سب نے اپنی گولیوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہ جہاں زخمی اور بیمار پائے گئے۔ قتل کر دیے گئے۔"

(سن ستاون، ص ۱۶۲، بحوالہ: تاریخ ہند، منشی ذکاء اللہ خاں، ص ۶۴۶)

اہلِ دہلی کے قتلِ عام کے بارے میں مانٹ گمری مارٹن لکھتا ہے کہ:

"جس وقت ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی تو جتنے شہری، شہر کی دیواروں کے اندر پائے گئے، انہیں اُسی جگہ سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی تعداد کتنی زیادہ رہی ہوگی جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ایک ایک مکان میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے یہ لوگ بلوائی نہ تھے۔ بلکہ شہر کے باشندے تھے۔ جنہیں ہماری مشہور نرم دلی اور معافی پر بھروسہ تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں مایوسی ہوئی۔"

[Letter in the Bombay Telegraph, by : Montgomery Martin]

ایک دوسرا انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ:

"دلی کے باشندوں کے قتلِ عام کا کھلا اعلان کر دیا گیا، حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُن میں سے بہت سے ہماری فتح چاہتے ہیں۔"

[The Chaplain's Narrative of the Seige of Delhi,
quoted by : Kaye]

اس خوفناک قتلِ عام کے دنوں میں صرف ایک دن کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لارڈ رابرٹس لکھتا ہے کہ:

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک گئے تو ہمیں شہر، حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔

کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کے سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا۔ جن میں سے کچھ مرنے سے پہلے پڑے سسک رہے تھے۔"

"چلتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے بات کرتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کُتے کھا رہے تھے اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع تھے جو ان لاشوں کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے تھے اور ہمارے چلنے کی آواز سے اُڑ اڑ کر تھوڑی دور جا بیٹھتے تھے۔"

"خلاصہ یہ کہ ان مُردوں کی حالت بیان نہیں ہو سکتی، جس طرح ہمیں ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا اسی طرح ہمارے گھوڑے انہیں دیکھ کر ڈر سے بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اُن کے سڑنے سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو پھیل رہی تھی۔"

[Forty Years in India, by : Lord Roberts]

ان میں سے بہت سے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا گیا۔ لیفٹیننٹ ماجنڈی نے اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سکھوں اور گوروں نے مل کر ایک زخمی آدمی کے چہرے کو پہلے اپنی سنگینوں سے بار بار بیندھا اور پھر دھیمی آنچ کے اوپر اُسے زندہ بھون دیا:

"اُس کا گوشت چٹخا، لپٹوں میں کالا ہو گیا اور جلتے گوشت کی سڑی بدبو نے اوپر اُٹھ کر ہوا کو زہریلا بنا دیا۔"

[Up Among the Pandies, by :

Lieut. Majendie, p. 187]

ٹائم اخبار کے نامہ نگار سر ولیم رسل نے لکھا ہے کہ:

"میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیاں کئی دن بعد میدان میں پڑی ہوئی دیکھیں۔"

[My Diary in India in the year 1856—59, Vol. I, p. 301—302]

گابرے ٹامسن نے سر ہنری کاٹن سے کہا تھا کہ دلی میں کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے زمین سے باندھ کر، سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا تھا۔

[Indian and Home Memories, by : Sir Henry Cotton, p. 143]

ان لوگوں کو مارنے سے پہلے کبھی کبھی بے دین کرنے کے لئے بھی کوشش کی جاتی تھی ایک انگریز پادری کی بیوہ نے لکھا ہے کہ:

بہت سے لوگوں کو پکڑ کر پہلے ان سے سنگینوں کے بل گرجا میں جھاڑو دلوائی گئی اور پھر سب

کو پھانسی دے دی گئی۔"

[A Lady's Escape from Gwalior, p. 243]

رسل لکھتا ہے کہ کبھی کبھی :

"مسلمانوں کو مارنے سے پہلے اُنہیں سوٗر کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا، اُن پر سوٗر کی چربی مل دی جاتی تھی اور پھر اُن کے جسم جلا دیے جاتے تھے اور ہندؤں کو زبردستی دھرم سے گرایا جاتا تھا۔"

[Russell's Diary, Vol. II, p. 43]

پنڈت سُندر لال نے ٹھیک کہا ہے کہ "اُن دردناک واقعات کے بارے میں زیادہ مثالیں دینا بہت تکلیف دہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار ساری دلّی خالی اور ویران ہو گئی بلکہ اُن اِنے گنے گھرانوں کو چھوڑ کر جن سے کمپنی کی فوج کو مدد مل رہی تھی، باقی سب شہریوں کو جو قتل یا پھانسی سے بچ سکے، زبردستی شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ موٗرخ ہومس لکھتا ہے :

"دلی کے باشندوں نے باغیوں کے جرموں کا کئی گنا کفارہ ادا کر ڈالا۔ دسوں ہزار مرد، عورت اور بچے بغیر گھربار کے ادھر ادھر کے علاقے میں گھوم رہے تھے جنہوں نے کوئی خطا نہیں کی تھی۔ اپنا جو کچھ مال اسباب وہ شہر میں پیچھے چھوڑ گئے تھے، اُس سے وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو چکے تھے کیونکہ سپاہیوں نے گلی گلی اور گھر گھر جا کر ہر قیمتی چیز کو ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور جو کچھ سامان وہ اٹھا کر نہ لے جا سکے، اسے انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

[A History of the Indian Mutiny, by : Holmes, p. 386]

سر جان لارنس نے، انگریزی کمانڈر کے نام دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں اعتراف کیا ہے کہ؛

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے سے بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے، اس کے لئے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بجانب ہوگا۔"

[Life of Lord Lawrence, by : Baswarth Smith, Vol. II, p. 158]

خود انگریزوں کے ان اعترافات کے بعد، غالب کے اُن بیاناتِ صفائی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ جو "دستنبو" میں انہوں نے انگریزوں کے ضبط و تحمل کی ذیل میں دیے ہیں۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں نے :

ـه : سن ستاون، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۶

"بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا۔"

"۔۔۔۔۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

انگریز مورخین ہی کی شہادتوں سے غالب کے اس بیان کی جو صریحاً انگریزوں کی مدافعت میں ہے تردید ہو جاتی ہے۔ "انگریز فوج کے سپاہی جہاں گھستے، جتنے آدمی انہیں راستے میں ملتے، انہیں وہ بغیر کسی امتیاز کے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا گولی سے اڑا دیتے تھے۔ جگہ جگہ پر پھانسی کے تختے کھڑے کیے گئے۔ جن پر چوبیس چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔ جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا۔"

[Narrative of the Indian Revolt, p. 69]

کے اور مالسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جو لوگ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے اُن کے ہاتھوں اور پیروں کو تفریح کے لئے انگریزی کے آٹھ اور نو (8 اور 9) ہندسوں کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا جب یہ ترکیبیں بھی کافی نہ دکھائی دیں تو انگریز افسروں نے گاؤں کے گاؤں جلانے شروع کر دیے۔ گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتیں تھیں۔ اور سب مردوں، عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی کئی انگریز افسروں نے بڑے فخر کے ساتھ ان دردناک نظاروں کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے آگ اتنی ہوشیاری سے لگائی جاتی تھی کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔

[Kaye and Malleson's History of the Indian Mutiny,
Vol. II, p. 177]

چارلس بال لکھتا ہے کہ:

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں، جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، جھونپڑوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔"

[Charles Ball's
History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 243—244]

ایک انگریز اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

"ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگائی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو ہم نے اُنہیں گولیوں سے اڑا دیا۔"

[Charles Ball's History of the Indian Mutiny,
Vol. I, p. 243—244]

مؤرخ سرجان کے لکھتا ہے کہ:

" فوجی اور سول دونوں طرح کے انگریز افسر اپنی اپنی خونی عدالتیں لگا رہے تھے یا بغیر کسی طرح کے مقدمے کا ڈھونگ رچائے اور بغیر مرد، عورت یا چھوٹے بڑے کا خیال کیے ہندوستانیوں کا قتل عام کر رہے تھے ہندوستان کے گورنر جنرل نے جو خط انگلستان بھیجے اُن میں ہماری برٹش پارلیمنٹ کے کاغذوں میں یہ بات درج ہے کہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو اُسی طرح سے ذبح کیا گیا جس طرح اُن لوگوں کو جو بغاوت میں شامل تھے۔ انگریزوں کو فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے یا خطوط میں لکھتے ہوئے بھی جھجک نہ محسوس ہوئی کہ ہم نے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں چھوڑا، اور کالے ہندوستانیوں کو گولیوں سے اڑانے میں ہمیں بڑا لطف آتا تھا اور حیرت انگیز خوشی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کی تاریخی کتابوں میں یا اگر کتابیں نہ ہوں تو اُن کی کہانیوں اور بیانوں میں ہمارے قوم کے خلاف یہ یادگار رہے گی کہ ہندوستان کی مائیں، بیویاں اور بچے جن کے نام سے ہم اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں، انگریزوں کے انتقام کی پہلی باڑھ میں بے رحمی کے ساتھ شکار ہوئے۔"

[Kaye's History of the Sepoy War, Vol. II, p.   ]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو اپنی کونسل کے اندر کہا تھا:

" نہ صرف چھوٹے بڑے ہر طرح کے مجرم ہی بلکہ وہ لوگ بھی جن کا قصور کم سے کم بہت ہی مشکوک تھا، بغیر کسی تمیز کے پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ گاؤں کو عام طور پر جلا ڈالا گیا اور لوٹ لیا گیا۔ اس طرح قصوروار اور بے قصور مرد اور عورت بچے اور بوڑھے سب کو بلا کسی تمیز کے سزا دی گئی۔"

(بحوالہ: سن ستاون، ص ۲۵۰)

غالب نے انگریزوں کے مظالم اور ان کی بے رحمی اور سفاکی کا تاثر ہلکا کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ "باغی" سپاہیوں کے طرزِ عمل کو حاشیہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا:

" ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء (کو) میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر (دہلی) میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے... (یہ) مدہوش سوار اور اکھڑ پیادے، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا۔ ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔"

"زمین ہر طرف گل اندامون (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔ افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دُنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔"

"(ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا۔"

غالب کا بیان ہے کہ شوریدہ سر، ظالم، مفسد، دیسی سپاہی انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے دیوانوں کی طرح انگریز افسروں کو قتل کیا۔ ان اکھڑ اور مدہوش انقلابیوں نے پری چہرہ، نازک بدن انگریز خواتین اور گہوارے میں کھیلتے ان کے ہنس مکھ، معصوم بچوں کے قتلِ عام سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ زمین ان گل اندامون کے خون سے رنگین ہوگئی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے اور ایک معتبر معاصر شہادت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر لے یارڈ نے ہندوستانی سپاہیوں کی مُبیّنہ غارت گری کی تحقیقات کرنے کی غرض سے خود انقلابِ ستاون کے دنوں میں ہندوستان کا دورہ کیا اور واقعات کی اصلیت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے کی سعیِ بلیغ کی۔ مسٹر لے یارڈ نے اپنی تحقیق اور تفتیش کے نتائج کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"نہایت غور اور ہوشیاری کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد، اچھے سے اچھے اور سب سے زیادہ اہم اور معتبر لوگوں اور سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ذریعوں سے جو اطلاعیں مجھے ملی ہیں، اُن سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ دلی، کانپور، جھانسی اور دوسرے مقامات پر جو بہت ہی خوفناک مظالم کہا جاتا ہے کہ انگریز عورتوں اور بچوں پر کئے گئے، وہ سب کے سب بلا ایک بھی استثنا کے جھوٹے اور فرضی ہیں، اور کہنے والوں کے خود اپنے من سے گھڑے ہوئے ہیں، جس کے لئے انہیں شرم آنی چاہیئے۔"

[Mr. Layard, M.P., in : The Time, 25th August, 1858]

(بحوالہ، سن ستاون، ص ۱۴۱، ۲۴۹)

آرام نے غالب کو کتاب کے نکل جانے کی اطلاع دی۔ اس کے جواب میں غالب ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب! تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

کتاب کا ایڈیشن نکل جانے کی اطلاع ملنے پر غالب نے اس خط میں ہند کی صورتِ حال کے بارے میں جو غیر رسمی رائے دی ہے، وہ مطبوعہ اصل اور کل کتاب پر بھاری ہے "دستنبو" میں انہوں نے ہندوستانیوں کو متّہم کیا ہے اور انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا گُن ان لفظوں میں گایا ہے:

"خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری (انگریز) عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوں بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

اس پس منظر میں مذکورہ خط، بنام شیو نرائن کی خط کشیدہ عبارت کے وزن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ:

"ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" کی غرضِ تصنیف، قلعۂ معلیٰ سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا، اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکامِ با اختیار کی نظر میں سرخرو ہونا تھا —— اور سرخرو ہونا، محض سرخرو ہونے ہی کے لئے نہیں تھا۔ حکامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی، پنشن کے اجرا کی آرزو اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی۔ انگریز

حکام کے لئے پر تکلف جلدوں کا اہتمام، ملکہ معظمہ کے لئے "قصیدۂ برگزیدہ در تہنیت فتح ہند" کی تصنیف اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر، اور اُن تک کتاب پہنچانے کی عجلت اور عالی مقام صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور راہ و رسمِ مراسلت کی فکرِ تجدید، اپنے مقصودِ اصلی کے لئے راہ ہموار کرنے ہی کی کڑیاں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے "غیر ملکی فاتحین سے جیسی سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا ہے، اگر ہم اس زمانے کے بے دریغ اور بہیمانہ قتلِ عام کو ذہن میں رکھیں تو اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوگی[۱]"۔ "یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء انقلاب سے اُن کے تعلق یا اس سے اُن کی ہمدردی کا ذرا سا بھی شبہ انہیں دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ غالب کی گزر اوقات کا وسیلہ پنشن (رہ گئی) تھی اور قبل اس کے کہ انگریز حاکموں کو اس کے دوبارہ اجرا کے لئے رضامند کیا جائے اس کے لئے اپنے استحقاق (یعنی بے گناہی) کو ثابت کرنا ضروری تھا۔ (بلاشبہ) یہ بات ایک ایسے شخص کے لئے اور بھی ضروری تھی جس کا تعلق اُمرا سے رہا ہو، اور جو دہلی کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا اُستاد، درباری اور دوست رہا ہو[۲]"۔ "یہی ہوا بھی، کہ غالب نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور پنشن کے لئے اپنا استحقاق جتانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہر عام آدمی ان حالات میں یہی کرتا، غالب سے ہمیں روشِ خاص کی توقع تھی، وہ پوری نہیں ہوئی"۔ "صورتِ حال جیسی بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب حالات غالب کے لئے ناساز گار ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے بہت سے دوسرے احباب کی طرح ذاتی مدافعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دی[۳]"۔

ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی، اس کتاب کے مندرجات کو ہر چند "حقیقتِ واقعی" کے بمنزلہ نہیں سمجھا جا سکتا، اس سرگزشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کے تابع رہی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر محمد اشرف کے بقول:

> "یہ بات یقینی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر حساس طالبِ علم کے لئے یہ کتاب ایک قابلِ قدر دستاویز ہے"۔
>
> (اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲)

غالب نے "دستنبو" کو بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، گو اس سے اُنہوں

---

[۱] تا [۳] ڈاکٹر محمد اشرف، اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰

نے جیسی توقعات وابستہ کرلی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ بایں ہمہ کتاب کی یہ اہمیت بھی مُسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے اور بالخصوص اُن کے اُفتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

○

"دستنبو" کا دوسرا ایڈیشن سات برس بعد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بھی کچھ خاص محرکات تھے۔ "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) کی اشاعت کو غالب نے اپنے لیے بہت سے مقاصد و مطالب کے حصول کا ذریعہ جانا تھا، لیکن اس سے انہیں کوئی فوری فائدہ نہیں ہوا جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے:

"مزید خطاب و خلعت تو درکنار، پہلا دربار و خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوئے اور اگلے تین برس انہیں واگزاشت کرانے کی دوڑ دھوپ میں گزر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے تو پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انہوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ:

۱۔ مجھے ملکہ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے۔
۲۔ دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے۔
۳۔ میری کتاب "دستنبو" حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔

اس پر گورنر جنرل نے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپورٹ طلب کی۔ چیف سکتر گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکہ معظمہ کا تو نہیں، لیکن انہیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ ہاں، سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویے کی تفتیش کی جائے، نیز ان سے "دستنبو" کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب میرزا سے "دستنبو" کا نسخہ طلب کیا گیا اس وقت وہ رامپور میں تھے۔"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

میرزا غالب رامپور میں نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز

ہو رہے تھے کہ حکومتِ پنجاب کی طرف سے انہیں "دستنبو" کا ایک نسخہ بغرضِ ملاحظہ چیف سکتر کے پاس بھیجنے کا حکم ملا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رامپور میں میرزا کو غالباً پہلے ایڈیشن کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اگر ملا، تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے حکومت کو بھیجا جا سکے۔ چونکہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اس لئے انہوں نے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے، اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں دوبارہ طبع کرایا اور دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔"

"حکومت کے میر منشی نے "دستنبو" کو دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس کتاب کی زبان پرانی پارسی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آ گئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔" (ذکرِ غالب، ایضاً، ص ۱۵۳، ۱۵۴)

"دستنبو" طبع دوم کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ کہ کتاب افادات انتساب بفرہنگ و دانش مرسوم و بدستنبوی موسوم، چکیدۂ قلم جادو رقم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب، عرف میرزا نوشہ مدّ اللہ ظلال فیوضہ باہتمام منشی بھندن لال صاحب در قالبِ طبع آمد و از نسخہ صحیحہ مرسلۂ مصنف صاحب نقل شد و تصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔"

ے "لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق، آگرہ میں چھپ رہا تھا۔ چھاپے خانے کے مالک منشی شیو نرائن نے میرزا کو ایک خط لکھا، جس کے لفافے پر پتے میں "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا۔ اس پر میرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لئے کہیں "میرزا نوشہ" کے الفاظ کتاب پر بھی چھپ نہ جائیں! اس نالائق عرف کو نہ کلکتے کے سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا ہے، نہ ولایت میں، لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ دونوں جگہ کے حاکم اُن کے اس عرف سے خوب واقف تھے۔ بہرحال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انہوں نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لئے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں، یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ اب اسے حکامِ بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، حاشیہ ص ۱۸۹ و بعد) بقیہ صفحہ ۷۳ پر

اس دوسرے ایڈیشن میں دو ایک جگہ لفظی تغیر ملتا ہے۔ ترتیب بھی بدل دی ہے۔ یعنی، اب کے پہلے اصل کتاب ہے جو پندرہ سطری مسطر صفحہ ۵۶ پر ختم ہوئی ہے۔ اسی صفحے سے، اُس قصیدے کا آغاز ہے (شماریافت، روزگاریافت) جو طبع اول میں شروع میں رکھا گیا تھا۔ یہ قصیدہ صفحہ ۶۰ پر ختم ہوا ہے، اور اس کے بعد اُس قطعے کا اضافہ کیا گیا ہے جو "فتح دہلی" کی خوشی میں (روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں) چراغاں کے موقع پر اُنھوں نے اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔ یہ ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے طبع اول کی دونوں تاریخیں (قطعات تاریخ آغاز و انجام کتاب از مہر و تفتہ) حذف کر دی گئی ہیں، کہ اب ان کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ "دستنبو" کے صرف یہی مستقل ایڈیشن میرزا غالب کی زندگی میں شائع ہوئے۔"

(مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲)

"دستنبو" طبع دوم کے تین برس بعد غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی تیسری اشاعت جنوری ۱۸۶۸ء میں "کلیاتِ نثرِ غالب" کے ساتھ شائع ہوئی "کلیات" علی الترتیب "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ یعنی "دستنبو" کلیات کی نثر سوم کے طور پر شامل کتاب ہے اور صفحہ ۱۸۹ سے ۲۱۲ کو محیط ہے۔ "دستنبو" کا متن صفحہ ۱۹۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۷ پر ختم ہو جاتا ہے صفحہ ۲۰۷ ہی سے، قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان، چار کالم میں طبع ہوا ہے اور ۲۰۸ پر تمام ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۰۸ ہی کے آخر میں قطعہ در بیان روشنی دہلی درج ہے۔ صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۲ "دستنبو" کی فرہنگ ہے۔ "کلیات" میں "دستنبو" کا متن جوں کا توں ہے، لیکن مالک رام کے لفظوں میں "آخر میں مشکل الفاظ کے فرہنگ مرتب کروا کے اضافہ کیے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں کیونکہ (اس کتاب) میں نادر اور نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں جو عام فہم نہیں تھے۔[1]"

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کیٹلاگ نمبر "۹۶ ۱۷۱ ۸ پنج" کے تحت "کلیاتِ نثرِ غالب" کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر اظہر علی (ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، پی۔ ایچ۔ ڈی، ۵۲، اے سی ماڈل ٹاؤن لاہور) نے پنجاب پبلک لائبریری کو ہدیہ کیا ہے۔ کلیات کے اس قلمی نسخے میں بالترتیب "پنج آہنگ"

(صفحہ ۷۲ سے آگے) یہی زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت صاحبِ مطبع کی صوابدید سے لکھ دی گئی اس کے لئے غالب سے استصواب نہیں کیا گیا، تام کے ساتھ خطابات کے اعلان سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ اُن کے نزدیک تو اس کتاب میں "اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر" تھا۔

(بنام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

[1] نگار، لکھنؤ، خاص نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۳

"مہر نیمروز" اور "دستنبو" شامل ہیں۔ خط بہت روشن ہے۔ کتابت بہت صاف صاف اور قلم سنبھال کر کی گئی ہے۔ اوّل تا آخر پندرہ سطری مسطر ہے۔ سر، عنوان وغیرہ سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ "دستنبو" کے خاتمے پر قطعات آغاز و انجام (از مہر و تفتہ) کے بعد یہ فقرہ ہاتھ سنبھال کر صاف صاف لکھا گیا ہے:

"ایں رسالہ بہ قرۃ العین میر سرفراز حسین فرستادہ آمد"

اس فقرے کا قلم اور قط وہی ہے جس سے پوری "کلیات" لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد خفی قلم سے پختہ و شکستہ رواں انداز میں ترقیمہ ہے:

"ایں رسالہ را بہ استمداد فرخندہ سیر، سعادت گستر، آسایش رواں، عزیز از جان اسوۂ آل نبی و اولادِ علی سید مہدی حفظ اللہ تعالیٰ فی الارض بتاریخ بست و ہشتم محرم سنہ ۱۲۸۰ ہجریہ قدسیہ (مطابق ۱۵ جولائی ۱۸۶۳ء) بمقام دہلی در حویلی مہابت خاں، خاکسار پریشاں روزگار، گنہ گار، بارگاہ ستار و غفار، سید حسن موسوی مشہور میر حسن بہ وقت سہ پہر روز پنجشنبہ ختم نمود:

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زاں کہ من بندۂ گنہ گارم

والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔"

ترقیمے کی اس عبارت سے، اس کے زمانۂ کتابت، کاتب اور نسخے کے مِلک کا پتہ چلتا ہے۔

"دستنبو" کی تیسری جداگانہ اور مستقل اشاعت (بمطابق طبع دوم) غالب کے انتقال کے دو برس بعد عمل میں آئی، در مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، واقع بریلی، ۱۸۷۱ء

انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں در "کلیاتِ نثرِ غالب":

- نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء
- نولکشور، کانپور: ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

○

"رستخیزِ بے جا"

۱۲۷۴ھ — ۱۸۵۷ء

(اُردو ترجمہ: "دستنبو")

"خُدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو، اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد، اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے، تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

——— غالب

"دستنبو" پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسیٔ قدیم میں تھی اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم جس کا اُس زمانے میں پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، ہندوستان کا تو کیا مذکور، غالب نے بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا تھا کہ بزبانِ فارسیٔ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔" اس لیے "دستنبو" کا اُردو ترجمہ کرنا بڑا کٹھن اور دشوار گزار کام تھا یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت اور غالب کے انتقال کے پچاس برس بعد تک کسی کو اِس "جرِثقیل" کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا اب سے نصف صدی پہلے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر میرزا محمد یعقوب بیگ نامی ایم اے نے پہلی بار اِس مشکل کام کو ہاتھ میں لیا۔ اُن کا ترجمہ ۱۹۲۲ء میں خواجہ حسن نظامی کی تالیف "میرزا غالب کا روزنامچہ" کے ساتھ شائع ہوا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"دستنبو" کا ترجمہ آسان نہ تھا، کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے۔ مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دے دیا۔" (روزنامچہ، طبع سوم، ص ۵۹)

"غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت، جس کو عربی الفاظ سے وابستہ محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔" (روزنامچہ، طبع سوم، ص ۷۲)

میرزا محمد یعقوب بیگ نامی کا ترجمہ، اس میں شبہ نہیں کہ بہت عمدہ ہے لیکن یہ پوری کتاب کا نہیں، اس کے صرف جستہ جستہ حصوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ اسی لیے یہ صرف گیارہ صفحات کو محیط ہے (طبع سوم، ص ۶۰-۷۱)

۱۹۶۱ء میں "دستنبو" کے دو الگ الگ کلی تراجم سامنے آئے۔ ایک رسالہ "اُردوئے معلّٰی" دہلی جلد دوم شمارہ ۲، ۳ بابت فروری ۱۹۶۱ء (ص ۱۷۷-۲۳۲) میں شائع ہوا۔ اس پر مترجم کا نام درج نہیں، دوسرا ترجمہ مخمور سعیدی کا ہے۔ یہ رسالہ "تحریک" دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء (ص ۵۳-۷۳) میں چھپا۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۶۸ء سے ۱۰ر جنوری ۱۹۶۹ء تک نو اقساط میں "دستنبو" کا اُردو ترجمہ روزنامہ حُریت، کراچی کے ادبی گزٹ میں بھی شائع ہوا۔ لیکن یہ رسائل اور اخبارات، اب عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگلے صفحات میں "دستنبو" کے جس اُردو ترجمے کا متن ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ "اُردوئے معلّٰی" سے ماخوذ ہے۔

بنام خداوند پیروزگر   مہ و مہر ساز و روز و شب گر

"میں اس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اس خدا کے نام سے جو طاقت بخشنے والا ہے جو چاند، سورج اور دن، رات کا خالق ہے۔"

عظیم طاقت کا مالک ہے وہ شہنشاہ جس نے نو آسمانوں کو بلند کیا اور سات ستاروں کو روشنی عطا کی۔ بڑا صاحبِ علم ہے وہ خدا جس نے جسم کو روح سے سرفراز کیا اور انسان کو حکمت و انصاف (کی دولت) بخشی۔ جس نے مادے اور وسائل کی مدد کے بغیر (سات (زمینوں) اور نو (آسمانوں) کو پیدا کیا۔ مشکل اور آسان کام کا بن جانا (اس سلسلے میں راستے کی) معمولی یا غیر معمولی رکاوٹوں کا دور ہونا، (ان سب امور کو) ان کی رفتار و اثرات سے متعلق کیا۔

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں (مختلف صفات رکھتے ہیں) ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں، اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، طاقت کے باوجود فرمان برداری نہ کریں اور قوتِ کارفرمائی اور صلاحیتِ تاثیر کے باوصف فرمان (قدرت) کے تابع نہ ہوں۔

"تم آسمانوں اور ستاروں کے راز (جاننے) کا کیا دعویٰ کرتے ہو۔ تم تو ابھی تک چت اور پٹ کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ ستاروں کی پرستش نہ کرو (ان کو دنیا کے کاموں میں مطلق صاحبِ اختیار نہ مانو) کیونکہ ایک آفتاب (خدا) بھی موجود ہے۔ جس کی روشنی (کائنات کی تمام) ظاہر و پوشیدہ چیزوں کو حلقے میں لئے ہوئے ہے۔"

اگر زہرہ و مشتری میں (سعد ہونے کے لحاظ سے) فائدہ پہنچانے کی کچھ صلاحیت ہے (تو ہو)

اور زحل و مریخ میں (نحس ہونے کے اعتبار سے) نقصان رسانی کی خاصیت ہے تو ہوا کرے۔ جو لوگ واقفِ حقیقت ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نحوست و برکت، اور مسرت و غم، کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں (اس) عدالت کے پیادے کبھی حلقۂ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔ مل جل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیلِ حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے سخت گیری کے (وسیلے سے) اُلجھے ہوئے کاموں کو سلجھانا چاہا، یا کسی نے نرمی کی (ذریعے) سے ہنگامۂ (زندگی) کی رونق افزائی کی تو یہ سب (زندگی کو) بنانے سنوارنے، (اور مشکلوں کو حل کرنے) کے مختلف انداز ہیں، ظلم یا بے نیازی نہیں:

"مُغنّی ساز کے تاروں پر مضراب سے ضرب لگاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے

مسرتیں مصیبتوں کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ دھوبی غصے میں آکر کپڑے کو پتھر پر نہیں مارتا۔"

درحقیقت کسی چیز کا فنا ہونا کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب بنتا ہے۔

حقیقتاً آرام و تکلیف اور بلندی و پستی ساری چیزیں (خدا کی طرف سے) انسان کو ملتی ہیں۔ اس لئے وہ سب فائدے اور بہبودی کا وسیلہ بن جاتی ہیں اور ان سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ دولت مند کسی محتاج کو چند پیسے دے یا ہزاروں روپے، ریشم کے تھان عطا کرے یا کمبل (ہر صورت میں) سخاوت اور درویش پروری ہے۔ قدرت کے عطیات کو اچھائی برائی کے خانوں میں تقسیم کرنا یا کمی بیشی (کا الزام رکھنا)، کج خیالی و کم فہمی ہے۔

یہ دنیا کی بے حقیقت چیزیں جو (فنا کے طاقت ور تھپیڑوں کے) سامنے ہیچ ہیں، کیا ان کے لئے یہ بخشش (خداوندی) کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔

لیکن یہ (دقیق) باتیں کم نظر اور کم معرفت لوگوں کی رسائی ذہن سے باہر ہیں اور اظہار بیان کی وہ طاقت بھی ختم ہوگئی۔ مجبوراً میں چند سیڑھیاں نیچے اترتا ہوں (آسان اندازِ بیان اختیار کرتا ہوں اور) انہیں کہی ہوئی باتوں کو صاف اور سادہ انداز میں کہتا ہوں۔ آسمان کی گردش چکی کی رفتار کی مانند ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چکی کو چلانے والا ضرور ہوتا ہے، پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ آسمان کو گردش میں رکھنے والا بھی کوئی ہے۔ آسمان کے چرخے میں ستاروں کی صلاحیتِ نفع رسانی و اذیت دہی کے تاروں سے بنی ہوئی پونی لگی ہے، جس سے چند پردے تیار کر کے اہلِ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ڈال دیئے گئے ہیں۔ صاحبانِ معرفت اور واقفانِ اسرار ان پردوں کے باوجود دیکھ لیتے ہیں کہ ہر کام کا کرنے والا خدا ہی ہے۔

"جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش حکم خدا کے تابع ہے تو پھر آسمان جو کچھ دے، ہم اس کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

سبحان اللہ! کتنا عظیم ہے وہ خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے جو ظلم کو ختم کرنے والا اور انصاف کی روشنی کو پھیلانے والا ہے۔ ۰ ۰ انصاف (کی طاقت) سے طاقتوروں کا زور گھٹا دیتا ہے اور اپنے کرم سے کمزوروں کو طاقت بخشتا ہے۔ ابابیل کے کنکروں کی ضرب سے فیل سوار خودسروں کا خاک میں مل جانا، یا ایک مچھر کا نمرود کو موت کے بستر پر سُلا دینا کیا تھا؟ یقیناً یہ وہ نشانیاں ہیں جن سے اس کی (بے پناہ) قوت وقدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ مجھ کو بتاؤ کہ یہ دو مختلف قسم کی تباہیاں جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں، یہ کس ستارے کی نگاہ ستم کا کرشمہ تھیں۔

"ضحاک، جمشید سے تخت وتاج چھین لیتا ہے۔ سکندر، دارا کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ عفریت، حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی اڑا لے جاتا ہے۔ جو دیو اور پریوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم جزا وسزا کے اسرار سے واقف نہیں ہو، بس آسمانوں اور ستاروں کو ہر چیز کا ذمّے دار سمجھتے ہو۔"

خُدا جس طرح کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس طرح ہر موجود کو فنا بھی کر سکتا ہے وہ خالق جس نے ایک لفظ "کُن" سے سارے عالم کو پیدا کیا اگر وہ اس عالم کو فنا کر دے تو کس کی مجال ہے کہ چوں وچرا کر سکے۔

○

اِس زمانے میں ہر راگ کا آہنگ اور ہر چیز کا قاعدہ ہی بدل گیا۔ سپاہی سردار سے منحرف ہو گئے۔ سخن طرازی سے کیا فائدہ، کہنا چاہیئے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ منجمین کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے آخری شہنشاہ یزدجرد کی محفلِ عیش عربوں کے حملوں سے درہم برہم ہو گئی تھی، اُس وقت زحل ومریخ دونوں برج سرطان میں جمع تھے۔ آج کل بھی برج سرطان، زحل ومریخ کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بغاوت، لڑائی، ظلم، خون ریزی اور ذلت اسی (قرانِ نحس کے) اثرات ہیں (لیکن) جو لوگ شناسائے حقیقت ہیں، وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز تھی، وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی۔ لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران کی قدیم داستانوں سے ان دو لڑائیوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے ایران پر (عرب کا) حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم وحکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا۔ ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا، اور اس کی بدولت آگ کی (پرستش اور) غلامی سے

نجات پائی۔ لیکن (ہندوستان میں) جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کی حفاظت کا سہارا لے کر (اپنے اس فعل پر) خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں؟

اہلِ ایران نے آتش پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا۔ لیکن ہندوستان والے، منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ دامن و دام اور داد و دد میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے، وہ مبارک مذہب (اسلام) ان زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن و راحت کی دولت بخشتا تو مصیبت زدہ غم و آلام کو بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقفِ راز و صاحبِ نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو بتائے اور میرے غم گیں اور خوف زدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے (امن و انتظام کے ذمہ دار) ملازمین، حاکموں سے بغاوت کریں۔ سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔

اے واقفانِ اسرار و عارفانِ سود و زیاں یہ سارا ہنگامہ خدا کا قہر ہے۔ ایران کی وہ جنگ اس قدر مایوس کن اور تباہ کار نہیں تھی:

"ساز سے پریشان نغمے اس لئے بلند ہو رہے ہیں کہ عالمِ اضطراب میں مضراب سے تاروں کو بے طرح چھیڑ رہا ہوں۔"

میں اس قدر نافہم نہیں ہوں کہ ستاروں کو روشن ہونے کے باوجود بے نور کہہ دوں۔ آسمان کو عظیم و بلند ہونے کے باوصف بے سرو سامان سمجھوں، مخلوق آسمانی کی کارگذاریوں کو جھوٹ سمجھوں۔ یا ان دو منحوس ستاروں (زحل و مریخ) کے ایک برج میں جمع ہونے سے آج بھی انہیں پُر آلام حالات کی توقع کروں جو اب سے ایک ہزار سال پہلے (جنگ عرب و ایران کے زمانے میں) واقع ہوئے تھے۔

میں جو زمانے کے ہاتھوں ناقابلِ علاج مصیبتوں میں گرفتار ہوں، مناسب سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر بسنے والے، جنہوں نے برج سرطان کو نہیں دیکھا ہے اور جو زحل و مریخ کے نام ہی سے واقف ہیں، ناشنیدہ اور ان دیکھی باتوں میں نہ الجھیں۔ بلکہ یہ سمجھ لیں کہ زمانے نے جس کے سینے میں ماضی و مستقبل کے راز محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کام کو بگاڑنا اس کی پرانی عادت ہے، اس امر کو روا نہ رکھا کہ غیر فوج کی دستبرد سے دانایانِ فرنگ کو نقصان پہنچائے۔ بلکہ اس نے اس گروہ (انگریز) پر اسی کی ہر جانب سے آنے والی افواج کو مسلط کر دیا۔

اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں جس کے عوض ۶۰۰ روپیہ سالانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کرلیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے اُستاد کا انتقال ہو گیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

میں بوڑھا اور کمزور تھا۔ نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے یاوہ خاطرِ حاضر نہ ہو جاتا تھا کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں، مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

---

[1] قلعۂ معلّٰی کی ملازمت ۱۸۵۰ء کا واقعہ ہے۔ غالب ۲۲ر شعبان ۱۲۶۶ھ (مطابق ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء) جمعرات کے دن بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش ہوئے۔ خطاب و خلعت پایا اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔

[2] "افسوس، صد افسوس کہ شہنشاہِ ملکِ سخن وری، خسروِ اقلیم معنی گستری ملک الشعراء خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد حضور والا نے شب ۲۴ر صفر شبِ آخر چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۵ر نومبر ۱۸۵۴ء عالمِ فانی سے بسوئے عالمِ جاودانی رحلت کی۔" (تتمہ دہلی اُردو اخبار۔ یہ تاریخ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۲۷۱ھ)

[3] قلعے سے اپنے تعلق کی نوعیت کو سرسری بتانا محض اپنی مدافعت میں ہے، ورنہ انہیں حضورِ شاہ قربِ ہر روزہ کی عزت حاصل تھی اور ان کی توقیر قلعے کے ممتاز ترین عہدوں پر فائز اصحاب سے کسی طرح کم نہیں تھی:

"کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے، ہر روز صبح کو قلعہ جانا، دوپہر کا آنا، بعد کھانا کھانے کے حضرت (بہادر شاہ) کے مسودوں کا درست کرنا۔" (بنام قدر بلگرامی، ماقبل ۱۸۵۷ء)

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں۔"

(بنام مجروح، ۶ر اپریل ۱۸۶۰ء)

"میرزا غالب کے کلیاتِ فارسی کو دیکھا جائے تو بہادر شاہ کے متعلق ۱۵ قصائد مدحیہ، دو مدحیہ مثنویاں اور ایک ترجیع بند موجود ہے۔ اُردو قصیدے یا قطعے ان کے علاوہ ہیں۔"

(مولانا غلام رسول مہر، قصائد و مثنویاتِ فارسی غالب، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۹)

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا، اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسائش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کر دے:

"یہ آسمان ایسا ظالم ہے کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغِ بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔"

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایتِ تخرجہ "رستخیزِ بے جا" ہے ـــــ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا۔ میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو، شہر کی حفاظت اور ذمہ داری اور حقِ نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین، گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین و صلح پسند) جو تیر و تبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جا سکتا؟ اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار

کردیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندا موں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔

افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بد نما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں، جس کے ہاتھوں لوگ غم زدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گردباد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے:

اے موسمِ بہار! بسمل کی طرح خاک و خون میں مل جا،

اے زمانے! اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا،

اے آفتاب (اس غم میں) اپنے رخساروں کو (پیٹ کر) نیلا کر لے،

اور اے چاند (غمگین) زمانے کے دل کا داغ بن جا۔

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ (اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لئے کمربستہ ہو گئے اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریائے خون کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کمروں سے گذر جائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرارداد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑو کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بند سے باندھا جاتا ہے، اسی طرح گنتی شمار سے باہر ان لڑنے والوں کی

کمریں بھی ایک ہی "کمر بند" سے بندھی ہوئی ہیں۔

بے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لئے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے، ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے۔ بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں توپیں، گولہ بارود، چھرے، غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا۔ لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

دل، لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں رخنۂ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیئے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیئے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا۔ جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختانِ بے ثمر سے پُر ہو۔ لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لئے) "خوانِ مفت" کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گمنامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ خنجر بہ کف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لئے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیمانہ کدھر ہے۔

(زمانے کی اس) بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ، جو سارا دن مٹی بیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے، اُن کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں

کوتوالِ شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے (زیور و آرائش سے معرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا، اس کو ان تو دولت گدازادوں نے چھین لیا کہ ان کی خود نمائی کے کام آئے۔ جو محبت کرنے والے پہلے نازنینانِ گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے، اب ان بد خصلتوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان سے سر و پا

لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح ناز خود نمائی میں محو رہتے ہیں، گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں، جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے، جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے۔ یکین، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں۔ جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہشمند ہیں:

"میرا درد بھرا دل تمہارے نزدیک ایک قصہ ہے اور بس۔ لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خون جاری ہو جائیں گے۔"

ڈاک کا انتظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے۔ ہرکاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی، ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش، بلکہ جنبش کی مضراب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں، انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا، کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سایے سے ڈریں۔ سپاہی، بادشاہ اور درویش ہر ایک پر حکومت کرنے لگیں۔ کیا یہ صورتِ حال لائق افسوس نہیں؟ ان روح فرسا مصائب پر آنکھیں آنسو نہیں بہائیں گی؟ اور کیا اس نوحہ گری پر لعن طعن کرنا، اس ماتم سرائی پر طنز کرنا اور اس گریہ وزاری پر ہنسنا جائز ہے؟ اور کیا ان پُر آلام حالات سے اظہار بیزاری کو ضعفِ ایمان اور نادرستیِ مذہب سمجھا جائے گا؟

"میں شعر و سخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب کہ آہِ گرم سے میرے دل پر ہزاروں آبلے پڑ گئے ہیں میرا دل بجھ چکا ہے اور قویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی۔"

اس سرگزشت پر مصیبت کا مارا ہوا یہ اسیرِ قیدِ بستر (تنہائی) اس روداد غم کو پھر شروع کرتا ہے جب پہلی بار وہ گم راہ جنگ جو آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے، خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر

شاہی آستانے پر جھکا دیے۔ جلد ہی زمانے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکا، فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گیا:

"فوج نے بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا جیسے چاند کو گہن لگ جائے۔ ماہِ نو گہن میں نہیں آتا۔ گہن تو چودھویں رات کے چاند کو لگتا ہے۔ بادشاہ اس چاند کی طرح تھا جس کو گہن لگ گیا ہو۔ وہ ماہِ کامل نہیں تھا۔"

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگجو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے قیدی جنہوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی، شاہی دربار میں آئے، سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی آقاؤں سے بھاگے ہوئے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کو بوسہ دیا اور کسی سرسبز علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہشمند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بوالعجبی ہے۔

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے، صرف شہر کے جانبِ مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدھا صفت، رعد خروش توپیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالمِ پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے، جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ آفتاب برج ثور و جوزا میں بے طرح آتش افروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بھنا جا رہا ہے۔ جو لوگ سرد و

ہوادار مکانوں میں آرام و آسائش کے ساتھ رہتے تھے، دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انہیں جلتے ہوئے پتھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو روئیں تنی کے باوصف اس کی ہمت و جوانمردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لئے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آجاتے ہیں۔ بیرونِ شہر کی داستان شب و روز تو یہ تھی۔ اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصہ سننے کے لائق ہے:

"میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنی ان کی زد میں نہ آجائے۔ میری زبان پر وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔"

ایک شخص جس کے دماغ میں فرمانروائی و تکبّر کے خیالات بھرے ہوئے تھے، درپردہ اپنے آقا اور مُربّی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ "اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے۔ اس کا راز کھل جائے گا" ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور[۱] کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں، فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑکاتا رہتا تھا۔

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خان کو) قتل کرنے کے لئے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لئے) اپنے آپ کو ان پر گرا دیا، اس طرح حکیم صاحب[۲] بچے۔

---

[۱] غالب نے شیونرائن کے نام ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ "بہ نسبت حکیم احسن اللہ کے جو بات مشہور رہے، وہ محض غلط ہے" لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے بعض معاصر شہادتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ صحیح نہیں ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کے خلاف بدگمانی بے اصل تھی"

(غالب اور ابوالکلام، ص ۱۶۵)

[۲] حکیم احسن اللہ خان کے بارے میں سر سید احمد خان کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کو کمال عزت و توقیر کے ساتھ جو پہلے دوائی فیروز لود جم کے بھروائی جھوادر ازاں بعد محمد اکبر شاہ بادشاہ دہلی کے معالج خاص رہے، رفتہ رفتہ بہادر شاہ ظفر کی طبیعت پر یہاں تک تصرف ہوا کہ:

"کوئی امر جزوی و کلی ... بے مشورہ و صلاح اس صاحب تدبیر صائب (باقی اگلے صفحہ پر)

جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا (حکیم صاحب کا) گھر (جو خوبصورتی و آرائش میں) نگار خانہ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگادی گئی۔ چھت کے شہ تیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے۔ دیواریں سیاہ پڑ گئیں، گویا وہ محل اس غم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا۔

ؔ "یہاں (دہلی) کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی (ان میں سے ایک) حکیم احسن اللہ خان، سو اُن کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہٰذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔"

(بنام شیو نرائن، ۱۲ر جون ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خاں) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔" (بنام: تفتہ، ۵ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ' دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔"

(بنام: حسین مرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔"

(بنام: غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

★ (ص۸۷ سے آگے) کے وقوع میں نہیں آسکتا، وہ امر اگرچہ متعلق منصبِ وزارت ہی ہو لیکن سبحان اللہ اس حوصلہ فطرت عالی پر ناز کرنا چاہیئے کہ ہر چند ترقی مدارج یہاں تک ہے کہ فقیر و قطبیہ قلعہ مبارک صرف اسی والا درجہ کی ذات پر موقوف اور مدارج جمیع امور سرکارِ بادشاہی کا اسی بلند اقتدار پر منحصر ہے، خُلق کو اس مرتبہ پر وسیع کیا ہے کہ ہر ادنیٰ کی کارروائی میں وسعت سے زیادہ مصروف ہونا اور ہر صاحبِ غرض کے التماس کو بدل متوجہ ہو کر سماعت کرنا اہالی شہر سے کم ہو گا کہ ان کو اپنا محسن نہ سمجھتا ہو۔"

(آثار الصنادید، طبع اول، مطبع سید الاخبار ۱۸۴۷ء، باب چوتھا)

غالب نے بھی حکیم صاحب کو اپنا محسن بتایا ہے (بنام: تفتہ، ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء) ایک دوسرے خط میں غالب نے حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"پروردگار اس بزرگوار کو سلامت رکھے کہ قدر دانِ کمال، بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیر محض ہے۔" (بنام: شفق، اکتوبر ۱۸۵۲ء)

"آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ بے وفا جس شخص کو آغوشِ محبت میں جگہ دیتا ہے، اس کو کشمکش و عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا بشرطیکہ وہ ولد الحیض نہ ہو۔ یہ خبیث، نمک حرام جس کے مُنہ پر چیچک کے داغ ہیں، بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دھانہ فراخ ہو گیا ہے، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولہے مٹکاتا ہوا انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدا زادۂ گم نام ہے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔۔۔

فوجیں ہر طرف سے آآکر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا، اس وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے علاقہ نیازمندی نہیں تھا، دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیازمندِ قدیم لکھا۔ خان بہادر خان نے جو گمراہ، شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا، ایک سو ایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں بھیجا۔

چشمِ بددور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرمان روائے رامپور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی (کا حق ادا کر رہے) ہیں، اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتۂ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں سے) رشتۂ تعلق توڑ لیا (بیش تر) انگریز (دشمنی کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے، لیکن (فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لئے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے، اس کم تعداد لیکن باشان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بٹھال دیا اور اس کو شہنشاہِ ہندوستان کا وزیر، اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہما کو گرفتارِ دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا، ایک منتخب شخص کو مناسب پیش کش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا۔ دو روز آرام کیا۔ پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے، دو کوہ صفت

ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پیش کی اور ایک جوڑ بازوبند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری شان و شوکت روشنی چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی۔ گویا زمانے کی نظرِ بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومتِ اودھ کی اس پیش کش کے بعد آئینہ وسکندر اور جام وجمشید کی ساری داستان ختم ہوگئی (باغی) فوج کے شور وغل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مُند گئیں۔ نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دُنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہو گیا:

"جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا رہتا ہے[1]"۔

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی۔ اُس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان وشکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی۔

"مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم وستم کا دور ختم ہوگیا اور انصاف کا زمانہ واپس آگیا۔ چار مہینے چار دن کے بعد سورج آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہوگئی۔ عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کرلیا۔"

اگرچہ ۱۱ر مئی سے ۱۴ر ستمبر تک ۴ مہینے ۴ دن کا وقفہ ہے، لیکن اس بنا پر کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر کے دن ہی قبضے میں آیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر

---

[1] یہاں اس مضمون پر مشتمل رباعی غالب کے سہو سے رہ گئی تھی۔ غالب نے تفتہ کے نام ۲۸ر اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط کے ذریعے اسے یہاں بتاکید اضافہ کرایا۔ شیونرائن کے نام ۳۱ر اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں بھی اس رباعی کو ضرور بالضرور درج کرا دینے کی ہدایت ملتی ہے۔

رباعی یہ ہے۔ ؎

جائیکہ ستارہ شوخ چشمی ورزد
افسر افسار و گرزن ارزن ارزد
خورشید ز اندیشۂ جا در گردش
بر چرخ نہ بینی کہ چسان می لرزد

کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لئے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بدباطن (باغیوں) کی جو فوج تھی، اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکر لڑنے کی تیاری کی۔ خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے اُلجھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

دو دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مردہ دل کا غم کدہ (مکان) وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا، لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سر و سامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں، جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اِس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد و عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحبِ حیثیت بھی، ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

لہ "انتخابِ غالب" (۱۸۶۵ء) میں، اسی بات کو بطور "لطیفہ" غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:
"۱۸۵۷ء میں جو میرٹھ سے باغی ترک سوار اور تلنگے دلی میں آئے اور انہوں نے شہر اور قلعے پر اپنا قبضہ کر لیا تو وہ مئی کے مہینے کی گیارہ تاریخ تھی اور دوشنبے کا دن تھا۔ قضارا جس دن ستمبر ۱۸۵۷ء میں دلی فتح ہوئی اور سرکش لوگ بھاگ گئے وہ بھی دوشنبے کا دن تھا۔ دو ایک دوستوں نے کہا کہ دیکھو کیا اتفاق ہے، دوشنبے کو دلی کا جانا اور پھر دوشنبے کو ہاتھ آنا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک مزہ ہے اس کو یوں تصور کرو کہ جس دن شکست کھائی اسی دن فتح پائی۔ یعنی دیر نہ لگی، ایک دن میں تدارک ہو گیا۔"

میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گنہگار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں۔ انگریز، بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناساز گار نہیں ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور اِدھر اُدھر بھاگتا پھروں۔

(اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں:

"میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں، خداوندا! کب تک یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی کان کے ہیں۔"

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قیمتیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سروسامان عطا کیا گیا ہے۔ مصیبتیں اور راحتیں اسی حکمِ ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر جس طرح بچّے، ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں، ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں۔

جمعہ کے دن محرم کی ۲۶ تھی اور ستمبر کی ۱۸، دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتاب، عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آ گیا اور اہلِ عالم کی چشمِ جہاں بیں پر تاریکی نے ظلم ڈھایا گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آ گئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی اندر سے بند ہے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اس طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیے۔ گلی سربستہ تو تھی ہی، دلبستہ بھی ہو گئی (ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہو گیا):

"میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں، کیونکہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔"

۱؎ یہ بے خوفی، اطمینان قلب اور استقامت و جراَتِ کردار کا اظہار محض ملمّع اور دکھاوا ہے۔ غالب کے خطوط، اس کی تردید کرتے ہیں اور ایک بالکل مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابلِ عزت لوگوں میں سے ہے (میری مراد ہے) حکیم محمود خاں، حکیم مرتضےٰ خاں، حکیم غلام اللہ خاں (سے) جو حکیم شریف خاں جنت مکان کی اولاد میں ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں۔ دور تک ان کی دورویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔

میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ وثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر (حکیم محمود خان) متعلقین اور اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے از راہِ بندہ پروری طاقت ور اور جنگجو (انگریزوں) سے طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہو گا، اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں، گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔[1]

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ان ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکان دار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں، نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ حجام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ان پانچ مہینوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے۔ کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا، لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال ختم ہو گئی (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم والم کا غبار چھا گیا:

"کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مصیبتیں خون کو آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔"

---

[1] "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والئ پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبانِ عالیشان (انگریز حکام) سے عہد لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟" (نامۂ غالب بنام تفتہ: ۵؍ دسمبر ۱۸۵۷ء)

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی صبر کے ساتھ دن گذارنے اور (اپنے آپ کو) سامانِ خور و نوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے:

"افسوس! یہ گریہ وزاری اور ذلت و محتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی و پریشان حالی اور بے سروسامانی!"

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، مہاراجہ (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی "ہر چہ بادا باد" کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ پہرہ ازراہِ دوستی تھا نہ کہ ازراہِ دشمنی، اس لئے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک... جا سکتے ہیں۔ چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔

مجبور و پریشان حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہشتی و مشک کا ملنا ناممکن تھا، اس لئے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مشکوں اور گھڑوں میں بھر لائے۔ اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی، جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے، سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا، نہ برتن میں روغن۔ میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن، تھیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے، ہماری روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمہ ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی سننے کو بات ملے۔ نہ خود باہر جا سکتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آیا، پانی برسا۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا

اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس بار یہ ہما صفت بادل پانی، چشمۂ حیوان سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی، مجھ پریشان حال نے وہ دولت (آبِ حیات) اس تباہی و بربادی کے عالم میں پالی ———:

" اے غالب! دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی (البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔"

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں، اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے:

"میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں، اور میں نشتر کی مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں"

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا (اتنی مدت سے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و شاعری میں مصروفِ جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہو گیا۔ خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خان بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے موت کی گہری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائقِ تعریف و صاحبِ جاہ و حشمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے اس فاتح اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ آگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری آرام و آسائش کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا (اب) میں بدنصیبی سے دوچار ہوں، اور دل طرح طرح کے خیالاتِ پریشان کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی۔ نہ کوئی لڑکا تھا، نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے، کہ میں نے اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے

بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زبان بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالم بے چارگی میں (دونوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن وگریبان کے پھول ہیں۔

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شور وغوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاترالعقل مالک اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اُٹھاتے اُٹھاتے) مر گیا۔

"میرے ہونٹوں پر صرف آہ وفغاں نہیں ہے، خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں بلب ہوں۔"

جو حالات میں نے بیان کیے یہ دل دکھانے والے ہیں۔ لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں، وہ بھی روح فرسا ہے۔ جو لوگ حالات سے واقف ہیں، میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غور سے سُنیں گے اور سن کر انصاف کریں گے۔

میں اس بڑھاپے میں چراغِ صبح اور آفتابِ لبِ بام کی مانند ہوں۔ میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے، وہی

۱۔ زین العابدین عارف (باپ) اور بستی بیگم عرف نواب دُلہن (ماں) کے بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں سے مراد ہے۔ عارف، غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے تھے۔ تفصیل کے لیے رجوع کیجیے: ذکرِ غالب، مالک رام، طبع چہارم، ص ۱۶۹، ۱۷۰

میرا حال ہے۔ دو سال ہوئے کہ میں نے ملکۂ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہِ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آقائے ہُنر پرور و حاکمِ نامور لارڈ ڈالن برا بہادر کے حضور میں بھیجا، جو گورنری کے زمانے میں از راہِ کرم میرے مربّی تھے:

راہ سخن کشودم اگر خود نہ شد کہ بخت

راہم بہ بزمِ بانوے گیتی ستاں دہد

یہ شعر اُسی قصیدے کا ہے۔ وہ قصیدہ اِسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین مہینے کے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سرو بوستان سروری (لارڈ ڈالن برا) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے متعلقینِ بارگاہِ شاہی کے سُپرد کر دیا۔ اس پر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن نہیں گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر رزنگٹن بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ جو قصیدہ لارڈ ڈالن برا بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا، اُس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرمانروائے ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہ انگلینڈ کے نام (لکھ کر) سکندر جاہ، فریدون حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا، اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مدّاح کی یہ خواہش ہے کہ ملکۂ معظمہ اپنی زبان (مبارک) سے مہرخواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخشیں اور اپنے خوان سے چند نانِ ریزہ (روٹی) کے ٹکڑے عنایت فرمائیں۔ مہرخواں اور سراپا کا ترجمہ عربی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نانِ ریزہ کو انگریزی میں پنسن کہہ سکتے ہیں۔

حاکمِ بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دلِ غم زدہ کو بشارت ملاداب سے شاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرت اثر سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر رسل کلرک بہادر کے خامۂ شکر بار

کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب نے) امیدواری اور آرزومندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں، اور میرا دل دونوں ایک دُوسرے کو مبارکباد دیتے۔

اب وہ مبارک خطوط جو میری پُر جوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس[1] ہیں اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوشِ گریہ میں آنکھوں سے ٹپکے ہیں، جگر خراشی و خون فشانی کے نام کے طور پر میرے دامن میں ہیں:

"میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدتِ غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں۔ خونِ جگر کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔"

ستمبر کی تیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی (مرزا یوسف) کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف خاں اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں دو ہندو کہیں سے آکر (گھر) میں پناہ گزیں ہو گئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے، اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔

---

[1] انگریز حکام کی ان تحریروں کو غالب اپنے حق میں سرٹیفیکیٹ خیال کرتے تھے۔ اسی حصۂ کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب نے والیٔ رامپور کے نام، ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھا ہے کہ:

"خدا کا شکر ہے کہ باوجود تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکہ معظمہ عالی مقام ہو گیا ہے۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور درازیٔ ملکہ دارا دربان کے دو سارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسی کتاب موسوم بہ "دستنبو" میں دیکھا چاہیے۔"

اگر کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی اور سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا (البتہ) بوڑھوں، عورتوں، اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر توسن خامہ رک گیا۔ اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم، قدم آگے بڑھائیے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو بُرا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔

بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھر بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لئے بلایا گیا ہے، ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں، اُن کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا۔ جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں، یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں، اُن کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال، سب کے دل درد سے بھرے

ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

۵؍اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا) دوپہر کے وقت اچانک چند گورے، اُس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آگئے راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کرکے راقم الحروف کے گھر میں (گھُس) آئے۔ (ان گوروں نے) بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانش ور اور کرنل برونؔ[1] کے پاس لے گئے، جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے (کرنل برون نے) مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل برون) کی تعریف کی اور چلا آیا۔[2]

۷؍اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوت) سامعہ کو نوازا، اور آگہی کو غرقِ حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب

۱؎ ۲؍فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام مجروح میں بھی غالب نے کرنل "برون" لکھا ہے۔ "انتخابِ غالب" (۱۶۵ء) میں بھی "برون" درج ہے لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے بتایا ہے، یہ دراصل "برنؔ" ہے Malleson کی تاریخ بغاوتِ ہند جلد ۲، ص۔ میں ہے:

"کرنیل Burn جو رخصت ہونے کی وجہ سے فوج کے ساتھ نہ تھے، مگر اب آگئے تھے۔ بہ تاریخ ۲۱ (ستمبر ۱۸۵۷ء) دہلی کے فوج گورنر مقرر ہوئے۔" (جہانِ غالب، معاصر، پٹنہ، حصہ ۴، ص ۳)

۲؎ "انتخابِ غالب" میں غالب نے اس واقعے کو "بطور نقل" ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"غدر کے دنوں میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہوئی جس مکان میں رہتا تھا، وہیں بدستور بیٹھا رہا بلی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کر اُس خاں کوچے میں اُتر آئے، جہاں میں رہتا تھا۔ اُس کوچے میں بہمہ جہت ۵۰ یا ۶۰ آدمی کی بستی ہوگی سب کو گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے چلے۔ مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا، نرمی سے لے چلے۔ راہ میں سرجن بھی آملا۔ وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا۔ وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا اوروں سے نام بھی پوچھا اور پیشہ بھی پوچھا فرمایا کہ اسد اللہ خاں بڑے تعجب کی بات ہے کہ باڈی پر نہ آئے۔ میں نے کہا کہ تلنگے دروازے سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

گورنر جنرل بہادر کے آنے پر اکیس توپوں کی۔ اکیس توپوں کی ہوش افزا سلامی کی کیا وجہ ہے۔ دوسرے دن بھی نہ اس ناواقفیت میں کوئی کمی ہوئی، نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہموار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے دل، کہ خدا کرے خون ہوجائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے بے کار ہوجائیں، اسی کام (لڑائی) کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

ادھر سوہنہ اور نوہ کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے، جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہوگئے ہوں۔ تلارام نامی ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں، جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے، رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں، جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بدنصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

جس دن گورے مجھ کو پکڑ لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا ڈوبے چوک کو دیکھ لینا، نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا گنجہ کے دانش ور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان سے کہا ہے:

"میں نہیں جانتا ہوں، دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا برائی۔"

ان لاعلاج غموں اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیئے کہ میں مرچکا ہوں۔ مجھ کو بازپرس کے لئے اٹھایا گیا اور بجزائے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنوئیں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً

(صفحہ ۱۰۰ سے آگے) باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے، میں کیوں کر آتا؟ (پھر) میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق، نہ مشورت کے قابل۔ ہاں، دعا کرتا، سو یہاں بھی دعا کرتا ہوں۔ کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا: "اچھا، تم اپنے گھر جاؤ، اور اپنے نوکروں اور اپنے علاقہ داروں کو ساتھ لے جاؤ۔ باقی اہلِ محلہ سے غرض نہ رکھو۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل صاحب کو دعا دیتا ہوا، اپنے گھر آیا۔" --- غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین کی روایت اس بارے میں قدرے مختلف ہے۔ (غالب نامہ آور۔ کراچی، ۱۹۶۹ء ص ۱۱۵)

اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا:

"مجھ پر جو کچھ آج گزر رہی ہے، اگر کل بھی یہی گزری (تو) آہ (کیا ہوگا)!"

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں، یا اُن واقعات (کا ذکر) ہوگا جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی، یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دارو گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قید (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بُری ہے یہ گدائی! اور وہ بھی اس بے سر و پائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالانکہ ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیئے تھا، اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں ادھر ادھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم و تاخیر پر ازروئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے، جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیئے، آتش فشاں اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1] پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت) کہاں لے جاؤں؟ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں؟ بازار میں اچھا، بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں، چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے

---

[1] یہاں غالب کا بیان مشتبہ ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے مضمون "میرزا یوسف" از مالک رام، نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۹ء

ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دونوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے، اُن میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی (قبر بنائی) میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے:

"افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد قبر میں اس کو بالینِ خشت بھی نہ ملا۔ خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اے خدا اس مرنے والے پر رحم کر کہ اُس نے زندگی میں آرام (کی صورت) نہیں دیکھی۔ اس کی دلجوئی کے لئے کسی فرشتے کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر:"

یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے، تیس سال ہوشمندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی (دیوانگی) کے عالم میں۔ زمانۂ ہوشمندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالمِ دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا، ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ کی شب میں مرگیا ہے:

"ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب میرزا یوسف کی تاریخ (وفات) پوچھی، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا: "دریغ دیوانہ۔"

واضح ہو کہ "دریغ دیوانہ" سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے "آہ" کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۷۴ رہ جاتے ہیں جو مطلوب ہیں:

"اُس خدا کے نام کہ جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے، تم جہاں سر جھکاؤ گے، اُسی کا آستانہ ہوگا۔"

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نامورانِ دانشمند امین الدین احمد خاں بہادر، اور محمد ضیاء الدین خان بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور امیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رخ کیا، جو ان کی آبائی جاگیر ہے پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُرانوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیرخواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر (اس) بے سر و سامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خان بہادر

نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے"۔ ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردار خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے۔ نذرِ غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے، اور جو سامان یہاں محلات میں تھا، سب لٹ گیا۔ بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم و زر محفوظ رہا، نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے۔ اس آغاز ناسازگار کا انجام بخیر ہو، اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

یقیناً اکتوبر کی ۷ تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانشمندانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے، قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمان کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لئے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۳ اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے، جیسے عبدالرحمان خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ اُن کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیز دست تباہ کاروں کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لُٹ گیا۔

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آ گئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا، ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سنیچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آجانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

واضح ہو کہ دہلی کی اجنٹی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں، وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں

ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا، قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیردار پاٹودی اور دوجانہ میں خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو! ان کی جہاں بیں آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان اور ذوالفقار الدین حیدر خاں جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے۔ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے۔ اور صحرانوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر (ان محلات و ایوانات کی) زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو (رقبہ) ہوگا۔ اتنے بڑے بڑے محل، اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھوں) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات، جس کی صبح کو راجہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اٹھنے لگیں، لکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت میرے مکان سے جانب مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت پچھوا چل رہا تھا، راکھ میرے اوپر آ رہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) ننھے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

راقم حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر ہے (سست ہے) (صفحہ) کاغذ پر (اس حالت، کی) کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی (اس طرح) موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا (اس طرح) رسن دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالم غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا، اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت

دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے، شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لحظہ سبزۂ سرِ دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بہ دستور) خالی ہے۔

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکمِ شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں۔ اس خیال سے ۲ر فروری کو منگل کے دن (حاکمِ شہر) کچھ پیادوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔

۵ر فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰی خاں اور اُن کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲ر فروری کو جمعہ کے دن پندرہ دوسرے اشخاص اور ۱۳ر فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آ گئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہو گیا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرّض نہیں کیا گیا، ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

فروری کے پُرشوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہِ فروردین تک (جو موسمِ بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے، سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حاکمِ مہربان، خورشید طلعت، ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم، ہندوستان خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں اُن کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے، اس بنا پر اس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدم نوروز پر مشتمل تھا اور ۱۹ر فروری کو جمعہ کے دن بذریعہ ڈاک بھیجا۔

۲۰ر فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوشخبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ر فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ، سپہ سالار نامور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دنیا کو آبادی کا مژدہ۔ اور اہلِ دنیا کو نویدِ آزادی کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور بُرے اور بدذات لوگوں کا دور دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں (کی گرج) اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصولِ طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لئے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے مبارک وقت میں، باغِ انصاف کے سرو آزاد آسمان رفعت کے ماہ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ حشم چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہم مہر و محبت کی بشارت دی:

"حاکم شاہ نشان (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آگئی۔ شہر میں مسرت کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے جیسے شہنشاہ شاہ جہاں آگئے ہوں۔"

۲۷ فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی۔ رات کے تین پہر گذر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلّا اُٹھے کہ چاند گہن میں آگیا۔ اسی سنیچر کو حکمِ دورباش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر، ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی تھی، ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے اردگرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہشمند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی اور اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی مضمون نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ انصاف طلب، چشم براہ اور

گوش برآواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں، جس کو میں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالات پریشان کے سبب سے حاکم (شہر) کی جائے قیام پہ جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے)۔ ابھی تک صبر، بے تابی پر غالب تھا کہ ۸ مارچ لوپیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آگیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانشور کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط، فرستندہ کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکمِ شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پُرفائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری گزارشات منظور ہو جائیں گی۔ وہ خط جس پر فرمان مسطور تھا، مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرور عادل، رعایا پرور دانشمند، چارلس سانڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور ایک خط خاص طور پر نامور موصوف (چارلس سانڈرس) کے نام منسلک کر دیا، جو خواہشِ دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

۱۷ مارچ کو بدھ کے دن فرمانروا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پُرآشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش، میں تو بندۂ شکم ہوں، مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھیں اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیچے گنبد میں گونج اٹھی۔ (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگریزی فوج کا حسب دلخواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص فرماں رواؤں کی نافرمانی کرتا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پہ جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (ستالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے۔ دنیا والوں کے لئے مناسب ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے، ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرمانوں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے

حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے۔ نغمہ طراز شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے:

"غلام (آقا کے) حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے؟"

۲۲ مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں فروری کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی آتا ہے اور وہ روز جہاں فروز (نوروز) انہیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ امسال شاید یہ شہر مُردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرت سننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے "سال دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئی آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہو گئے اور فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سنی ہی نہیں۔ آفتاب برج حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ اُگے اور پھول نہ کھلیں۔ اصولِ آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصولِ گردش کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔ میں باغ پر نہیں، اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے موسمِ بہار کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ اپنی بد قسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں:

"دُنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور و بے سرو سامان بیٹھا ہوا ہوں۔ بہار کا موسم ہے اور میں بالکل بے سرو سامان ہوں، مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔"

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پروا ہے۔ میں زاویہ نشینِ غم والا اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کو خوشبو سے معطر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا کمی آجائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں جس میں دو ثلث ماہ فروردین کے اور ایک ثلث ماہ اردی کا ہے، حکیم محمود خاں کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خاں) سارے رشتے داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا۔[1] کہتے ہیں

---

[1] "آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالے کو گئے ہیں۔ میں بمقتضائے وقت، اپنی سکونت

(باقی اگلے صفحہ پر)

ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے۔

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا۔ جو بداندیش (باغیوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لئے عالی نسب سرچشمہ علم و دانش نواب یوسف علی خاں بہادر کے حوالے کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خان) جو دنیا کو فتح کرنے اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں، اس علاقے پر تعمیلِ حکم کے طور پر فرماں روائی کر رہے ہیں، (اور مجھ کو) امید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدہا شکار فوج نے جب (بریلی و مراد آباد کے) اسس علاقے پر یورش کی، تو بریلی کے گناہ گار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورت حال (کو دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) ادھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں، شہروں، گاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں۔ اُن کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیرِ سایہ آجائے گا۔

۱۳ جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکمِ شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا، جو قلعہ میں نظر بند تھے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ گئے۔ جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیے جانے کی خوشخبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہو گی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہوگا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خاں) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے، ابھی افقِ مشرق سے بقدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (۲۱ ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دل کو مسرت و شادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعہ کے ہاتھ آجانے کی خوشخبری جو زمین کا جگر گوشہ اور پہاڑ کا لختِ جگر ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مژدۂ پُر مسرت نے) حاکموں اور فرمانبرداروں کو آرزوؤں کے چراغ جل اُٹھنے

(صفحہ ۱۰۹ سے آگے)

کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آرہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔"

(نامۂ غالب، بنام: غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

(آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی ۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرمان روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگرے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں سے) امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی۔ (باغیوں نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا (تھا) یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گم راہوں کا انجام یہ ہوگا، کہ بدحالی و پژمردگی کے ساتھ اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھریں گے۔ اور آخر کار جگہ جگہ ذلت وخواری کے ساتھ مارے جائیں گے، ان کے صحرانورد گھوڑوں کو بے آب وگیاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے سازوسامان کو گذرگاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے۔ پھر ہندوستان خس وخار (ظلم وستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہوگا اور ہر رہ گذر بازار کی طرح پُر رونق نظر آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے ترسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرسا غموں (کے سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے۔ مجبوراً، سحر نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دھراتا ہوں اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غم زدہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے، اِن اشعار (کو پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قید رنج وغم سے آزاد تو کر ہی لوں گا:

"افسوس! ہمارے بغیر اس دنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر، دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے، جب کہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے۔"

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی، ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں، اگر خدا دوست، خدا شناس، فیاض دریا دل مہیش داس دیسی شراب قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا، اسی عالم جگر تشنگی میں مرجاتا:

"عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے (آرزو یہ تھی کہ) شراب ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں۔ دانشمند مہیش داس نے مجھ کو وہ آب حیات بخش دیا جس کو سکندر

نے اپنے لیے ڈھونڈا تھا۔"

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ خدا کی مرضی نہیں تھی، کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس نیکی پسند بہی خواہ (مہیش داس) کا اس انتظام میں دخل رہا ہے، قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے، زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گذارتا ہے۔ اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

میرے دوسرے متعلّقین اور شاگردوں میں سے ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (برابر) آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیوجی رام برہمن جو ایک عقلمند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے، مجھ دردکش غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ فرمانبرداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق نوجوان ہے، اپنے والد کی طرح تعمیل حکم میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمان محبت کے ماہِ کامل شیوابیان[1]، ہرگوپال تفتہ (بھی ہیں) جو میرے پرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں سرتاپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جزوِ روح سمجھ لیا ہے اور "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ انہوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی[2] میرے پاس بھیجی، نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

---

[1] "التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی ایک ہزار بیتیں کی لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، ہندی، انگریزی جو ہیں، وہ لکھ دیتے ہیں مثلاً تمہارا نام "منشی ہرگوپال" منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا، اس کی جگہ "شیوازبان" لکھ دیا ہے۔" (بنام تفتہ: ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء)

[2] یہ ہنڈی سو روپے کی تھی۔ روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا تھا کہ: "مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔" اس پر تفتہ نے بڑی عجلت دکھائی اور فی الفور سو روپے کی مالیتی ہنڈی بھجوائی غالب نے اس کی رسید دیتے ہوئے اس رقم کا قصہ جس طرح تمام ہوا اس کی جو تفصیل لکھی ہے وہ لطف سے خالی نہیں: "سو روپے کی ہنڈی بل جو کچھ کہیے ملا۔ ایک آدمی رسید مہری دے کر نیل کے کٹڑے میں چلا گیا، سو روپے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ سو میں روپے داروغہ کی معرفت

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ (ان لوگوں کی) فیاضی اور محبت کا شکریہ ادا ہو جائے، نیز اس لیے بھی (لکھیں) کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن میں دیواروں کے روزن دھویں سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے، اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور (اپنے) سایہ کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے:

"اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب و رنگ نہیں آتا ہے جب تک کہ ہزار بار اشکِ خوں سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم و افسوس، جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے (تیار ہوا) ہے۔"

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ (گردش) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جب کہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی، اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا (لیکن) میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا[1]۔ اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں، زیور، وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا، تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا، وقت نکل چکا تھا (وہاں تک جانے اور (سامان) لانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی) اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گذار رہا ہوں[2]۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں،

لٹھے تھے وہ دیے گئے، پچاس روپے محل میں بھیج دیئے۔ چھبیس روپے باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔... خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے بھائی بری آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔" (بنام تفتہ: ۳ فروری ۱۸۵۸ء)

[1] غالب کے خطوں سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس کی تکذیب ہوتی ہے: "میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔" (غالب بنام محمد میر دزنامۂ سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

[2] کپڑے بیچنے کا ذکر انہی ایام کے ایک خط میں اس طرح کیا ہے: "کئی دن ہوئے... جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی

میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھالوں گا عالمِ برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔

اس قیامت سے پرانے نوکروں میں سے دو، تین، نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ ان کی بھی پرورش کرنا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی، آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس گروہ (ملازمین) کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھانے کے عادی ہیں، اس بُرے وقت میں بھی اپنی رُوح فرسا آواز (سوال) سے مرغ کی صدائے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جبکہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور رُوحانی اذیتوں کی گُداختگی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے، یکایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں (جس کا نام تصنیف ہے) کب تک مشغول رہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کش مکش کا انجام یا تو موت ہے یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم رہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت میں (یہ بات) ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سرِ بازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جا سکتی ہیں اور اپنے آپ کو (کہاں تک) رسوا کیا جا سکتا ہے۔ باقی پنشن اگر مل گئی، تب بھی آئینہ (دل) سے زنگ (غم) صاف نہیں ہو سکے گا۔ (قرض ادا نہیں ہوگا) اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ یہاں (دہلی) کی آب و ہوا، مصیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے، یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

مئی سال گذشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد میں نے لکھی ہے، یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے، جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس مرتبہ، سنجر شکوہ، سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم اس بات کے لیے اس کا شکر گزار ہے

•

۔وال دُھانی گرنا دلال کو دیا ۔۔۔۔ اور وہ اس وقت روپیہ کر آیا۔" (تفتہ، ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

قریب سوا سال بعد تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کی فکر کچھ نہیں۔" (۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی فرماں روائے روس کا دل اس کی لشکر کشی کے خوف سے دو نیم ہے آفتاب اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے اگر ڈرتا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ہر لمحہ کانپتا رہتا ہے اور ماہ کامل اس اندیشے سے کہ دُنیا کو منور کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے:

"وہ مالک تیغ و نگیں و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز ہے۔ صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک خو ہے اس کا مرتبہ انصاف میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔ جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ اس لیے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ اس ملکۂ نامور کے سپرد کر دے۔

خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر زحمت اُٹھائے ہوئے ملکہ کو بطور تحفہ ملے ہیں۔

وہ تخت (سلیمان) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لیے جاتی تھی فرشتۂ غیب نے ملکہ کے سامنے بطور پیش کش پیش کیا ہے۔

تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں میں پتھروں کے جگر سے گوہر رنگارنگ بر آمد ہوتے ہیں سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے، ورنہ اُسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لُٹائیں تو کثرت بخشش سے یہ حالت ہوگی کہ اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے، پہاڑوں میں اژدھے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ (اس کے در کے) گدا ہیں،

اس کی ضیاء بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم و فیاضی سے اہل علم و دانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحب خرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی عقل رسا، ان کا نام ملکۂ عالم وکٹوریہ ہے۔

خُدائے پاک ان کا نگہبان رہے (خدا کرے) اس محفل (ہستی) میں اُن کا قیام دیر تک رہے۔"

اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا:

" جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہو گیا، میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں "

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام "دستنو" رکھا گیا (یہ کتاب) لوگوں کو دی گئی اور ادھر اُدھر بھیجی گئی تاکہ صاحبانِ علم و دانش کی رُوح کو تسکین بخشے، اور انشا، پرداز (اندازِ نگارش پر) فریفتہ ہو جائیں اُمید ہے کہ یہ مجموعۂ دانش (دستنو) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستۂ پُر رنگ و بُو ہوگا اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند۔ آمین:

" ہماری طبیعت جو ہمیشہ رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رازہائے آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصہ ہے اس کاردانی کے لحاظ سے (گویا) ہم ساسانِ پنجم ہیں "

○

"دستنبو" اور "غدر" کے بارے میں غالب کی ایک اہم تحریر :

ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا
پہنچنا معلوم ہوا دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپکو اختیار ہے مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو
اب بھیجا ہے اسکا دیکھنا ضرور درکار ہے فارسی قدیم اور پھر حسن معنی اور صنعت الفاظ با اینہمہ
ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ جناب عالی طرفہ معاملہ ہے خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ
ہے خدا کا شکر یہہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں قسمت کا
گلہ یہ کہ عطائے پنسن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ انیسواں مہینا ہے گویا
بن کھائے جیتا ہے کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنسن داروں کو روپیہ ملیگا دیکھئے کیا نیا
گل کھلیگا پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکہ معظمہ
عالیمقام ہو گیا ہے میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملکہ دارالسلطنت لندن سے
دو ساغر مکرمت پا چکا ہوں اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہئے تو اس کتاب موسوم
بہ دستنبو میں دیکھا چاہئے خشنودی کا طالب غالب نگاشتہ روز یکشنبہ ہفتم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

۱ [انقلابِ ستاون، اور غالب کا عالمِ تذبذب]

زمانہ کا رنگ اور، کوئی حاکم کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں بڑی میرے مربی قدرداں جناب
اڈمنسٹن صاحب. وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے لفٹننٹ گورنر ہو گئے وہ سکرتر رہتے
تو مجھے کچھ غم نہ تھا اب تک میں اپنی کو یہ بھی نہیں سمجھا ہوں بیگناہ ہوں یا گناہگار
مقبول ہوں یا مردود مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں
لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے بہر حال اسکا
تشویش میں ہوں راہ چارہ مسدود اور دکھ موجود عرفی خوب کہتا ہے ۔ مرا
زمانہ طناز دست بستہ و تیغ ۔ زند بفرقم و گوید ہاں سرے خارد
مرقومۂ صبح یکشنبہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء

اِنقلاب ۱۸۵۷ء :

رُوداد اور اثرات مابعد

(ماخذ : خطوطِ غالب)

• ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں —— جو زندہ ہے، اُس میں مقدور نہیں۔"

غالب، بنام شیو زائن آرام، ۱۹۔ اپریل ۱۸۵۹ء)

"مَیں نہیں جانتا کہ ۱۱۔مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دہلی میں آئی تھی یا خود قہرِ الٰہی کا پے بہ پے نزول ہُوا تھا۔ بقدرِ خصُوصیتِ سابق، دلّی ممتاز ہے، ورنہ سَرتا سَر قلمروِ ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔" (بنام: انورالدولہ شفق، ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء)

"دکئی) لشکر کا حملہ پے در پے اِس شہر (دہلی) پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[1] کا، اِس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سَراسَر لُٹ گئے ــــــ" (انوارالدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سُن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہُوا تو کہا جائے گا۔ ورنہ قصّہ مختصر، قصّہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وُہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟" (ثاقب، ۸۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"مُبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مُفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مُلازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مُبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اِس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔" (تفتہ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"اِنصاف کرو (خط) لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ ... بس اِتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ مَیں لکھوں گا ــــــ" (غلام نجف خاں، ۲۶۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدھم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امُور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں،

---

[1] "خاکیوں سے مُراد انگریزی فوج کے آدمی ہیں، ہندوستانی بھی اور گورے بھی کیونکہ ان کی وردی خاکی تھی۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۳۳)

دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے ؟" (تفتہ ، ۵۔دسمبر ۱۸۵۷ء)

"جو دم ہے، غنیمت ہے ، اس وقت تک مع اعیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم، ہات میں لیے پر بہی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔ ورنہ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ راجعُون ٥"

(غلام نجف خاں، ۱۹۔جنوری ۱۸۵۸ء)

"مُنہ پیٹتا ہوں اور سَر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انورالدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں ، پھر اس کے بعد مروں ــــــ"

(انورالدولہ شفق ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"وہ عزّت اور ربط ضبط جو ہم میں رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں ! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے ــــ" (تفتہ ، ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"کئی دن ہوئے . . . جو میں نے ایک ولایتی چینہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گزا (پیسوں کی ضرورت سے فروخت کے لیے) دلّال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا۔"

(تفتہ ، ۱۸۔جولائی ۱۸۵۸ء)

"روٹی کھانے کو نہیں ، شراب پینے کو نہیں ۔ جاڑے آتے ہیں ، لحاف توشک کی فکر ہے ــــ"

(مجروح ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی ، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی مل جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ، ابھی ہے ، اس کی فکر کچھ نہیں ــــ"

(تفتہ ، ۵۔نومبر ۱۸۵۹ء)

"نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح، کہیں سے پہنچ گئی ہے، آج کاغذ اور ٹکٹ کہیں سے منگا لوں گا ——"

(مجروح، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہُوں۔ اُس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہِ راجعُون ہ"

(یوسف مرزا، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (۱۸۵۵ء) میں، میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم اُن کو تخلّص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، مَیں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھُلا ہُوا، اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا ——" (خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"فتنہ و فساد کے دِنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنسن مسدود۔ یہ بزرگوار (والئ رامپور) وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا، تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہُوئی ——"

(میاں داد خاں سیّاح، ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۵ء)

"خاص، اپنا دُکھ روتا ہوں: ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلّو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجُود ہے۔ میاں گھمّن گئے، گئے مہینے پھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی، تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانیوالے موجُود۔ مقام معلوم (رامپور) سے کچھ آتے جاتا ہے، وہ بقدرِ سدرمق ہے۔ محنت وُہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں

بھوت نہیں ۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں ؟"

(یوسف میرزا ، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے ، نہ جاہ وحشم رکھتے تھے ، نہ املاک تھے ، نہ پنسن رکھتے تھے ___"

(حسین میرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"عمر بھر نوکری نہ کی ، نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا ، پھر اُستاد کہلایا ___"

(میر بندہ علی خاں ، ۱۸۔ جنوری ۱۸۶۴ء)

"بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد (مرزا فخرو) نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ دِلّی کی سلطنت سخت جان تھی ، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔"

(چودھری عبدالغفور سرور ، نومبر ۱۸۶۰ء)

"--- واز مئی (۱۸۵۷ء) خود آشکار است کہ حال چیست ؟ پیوندِ تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ واز دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریاری می پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مباد ، اگر یک قلم ترک آمیزش کنم خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف اُفتد ، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔ ہرگاہ شہر بر دستِ سپاہِ انگریز فتح شُد ، ہمہ جاگیرداران و پنسن داران از شہر بدر رفتند ، چنانکہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند ، من از جانہ جُنبیدم ، و ہم چناں گوشہ گیر ماندم۔ درین بند و بست کہ خاصہ از بہرِ سیاستِ مجرمان ست و تحقیقاتِ جُرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مُخبران می کنند ، ہیچ گونہ آلایشِ دامنِ من پدید نیامد و دار و گیر و باز پُرس رو نہ داد۔ بودنِ من در شہر از حُکّام نہان نیست۔ اما چوں پرسشی درمیان نیست ، لاجرم محفوظ ماندہ ام۔ می بایست کہ خود سلسلہ جُنبان گشتمی و با حکام پیوستمی۔ درین بارہ سخن آنست کہ درین زمانہا با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم۔ و معہذا ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات بمیان آورم۔ راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب ضعفی بجانیافہ دہم۔

لیکن مقامِ شکر است کہ بتقدیم زیدن خدمت از راہِ بیدستگاہی است ، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بیگناہی است ــــ" (نواب یوسف علی خاں ، ۱۴۔ جنوری ۱۸۵۸ء)

"مَیں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر مُتعلق ہُوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اِس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، مَیں نے دخل نہیں دیا، صِرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مُخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بُلائے ہُوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی ــــ" (تفتہ ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"حقیقتِ حال، اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لُٹا نہیں، کسی محکمے میں اب تک بُلایا نہیں گیا، معرضِ بازپُرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے ؟" (غلام نجف خاں ، ۲۱۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"بھائی! میرا خیال ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مُندرج نہیں نِکلا۔ کسی مُخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر، بدخواہی کی نہیں دی۔ حُکامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہُوں، بُلایا نہیں گیا، دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی بازپُرس ہو تو بُلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیساکہ بُلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں مِلا، خط کسی کو نہیں لکھا، کِسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی ــــ" (تفتہ ، ۳۱۔ جنوری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بدستور ہے، دیکھیے خُدا کو کیا منظور ہے ؟ حاکم اکبرآباد نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب، میرے آشنائے قدیم ہیں مگر مَیں مِل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب نہیں آیا ــــ" (تفتہ ، ۵۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"مَیں مخفی نہیں ہُوں، روپوش نہیں ہوں۔ حُکام جانتے ہیں کہ یہاں ہے۔ مگر نہ بازپُرس و دار و گیر

میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصدِ ملاقات کیا ہے۔ بایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہے ؟" (مجروح ، ۷۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"بھائی بُری آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔" (تفتہ ، ۳۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بدستور ہے : نہ نویدِ کامیابی، نہ نہیبِ نااُمیدی۔" (تفتہ ، ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء)

"مَیں مع زن و فرزند، ہر وقت، اِسی شہر میں قُلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہُوا، نہ مارا گیا ——"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے ؟ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا ؟ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے ——"

(تفتہ ، ۳۱۔ جنوری ۱۸۵۸ء)

" کیا پنسن اور کہاں اس کا ملنا ! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اِک قُلزمِ خوں کاش یہی ہو !
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے ؟

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی ——"

(مجروح ، ۷۔ فروری ۱۸۵۸ء)

" یہ خُدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور مَیں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہُوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو (۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے) لگاؤ نہ تھا ——"

(تفتہ ، ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"خُدا کا شکر، یہ کہ باوجود تعلقِ قلعہ، کسی طرح کے جُرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں ——"
(نواب یوسف علی خاں، ۷۔ نومبر ۵۸ء)

"پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا، بھی میرا کیا گزارا ہوگا؟ ہاں، دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام: "چولہے ولدر نہ ہوگا۔"
(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ "غدر" میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہُوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت مَیں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ اَنداز و ادا سے پنسن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے ——"
(غلام نجف خاں، جولائی۔ اگست ۱۸۵۸ء)

"پنسن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھیے کب ملے گا؟ اس کے ملنے تک کیا ہوگا اور اس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظر اِن اُموز سے، اس وجہ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے ——" (غلام نجف خاں (؟) ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء)

"بعض لوگ یہ گُمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنسن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھیے کہ آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو مَیں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں؟"
(یوسف میرزا، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"بِللہِ الحمد کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا ——" (چودھری عبدالغفور سرور، فروری مارچ ۱۸۵۹ء)

"گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ مَیں بے گناہ ہوں، مُقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں ——" (خواجہ غلام غوث بے خبر، ۳۰۔ جنوری ۱۸۵۹ء)

"(رہا میرا حال)، تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پرسد ؟ نہ جزا، نہ سزا، نہ نفریں، نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر ———" (تفتہ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"دربار میں جاتا تھا، خلعتِ فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں۔ نہ گنہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد ———" (یوسف میرزا، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرا دربار اور خلعت، دریا بُرد ہو گیا۔ نہ پنشن کی توقع، نہ دربار اور خلعت کی صورت۔ نہ جزا، نہ سزا، نہ انعام، نہ رسمِ معمولِ قدیم ———" (حسین میرزا، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"اب تک مَیں اپنے کو یہ بھی نہ سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گنہ گار ؟ مقبول ہوں یا مردود ؟ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔" (نواب یوسف علی خاں، ۲۷۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو ؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے ؟"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"مَیں کروں کیا ؟ فی الحال دودمانِ معنی کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلاء جانتے نہیں، علماء، اعتنا نہیں کرتے ———"

(جنوں، ۸۔ مئی ۱۸۶۴ء)

"(میرا) حال بہ سبیلِ اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ ہوں اور حکام کی عنایت سے محظوظ ہوں۔ بے وفائی کا داغ نہیں لگا ہے ———" (احمد حسن عرشی، ۱۸۶۰ء)

"میرا دکھ سنو : بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا۔ دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی

بے خیالی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔ اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسداللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا ؎

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عندالملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ گزرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چُپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھی کہ یہ جو اسداللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے۔"

(حسین میرزا، ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء)

"بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا، وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اِس سکے کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ ایک کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پرچۂ اخبار دیکھے جائیں۔"

(حسین میرزا، ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء)

"جناب چودھری صاحب! آج کا خط کاسۂ گدائی ہے۔ یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّیٰ بہ "دہلی اردو اخبار"

بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکے اُن کے نام کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مُندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اس مہینے کے بعد سکے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام (اصرار) ہے کہ اگر مثلاً کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا بھیجیے ——" (چودھری عبدالغفور سرور، جون ۱۸۵۹ء)

"وہ "دہلی اُردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مُفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ مَیں نے سکہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حُرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ مُعظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللّٰہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں ——" (یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوق کے مُعتقدین میں تھے، اُنہوں نے "دلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اَب تک، وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اُس زمانے میں مُرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ مَیں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اُردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا[۱]۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و

---

[۱] "لیکن اگر یہ پرچے دستیاب ہو جاتے تو بھی، اُن کے مفید مطلب نہیں ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ اگرچہ اُس وقت میرزا

باقی صفحہ ۱۳۰ پر

دربار بھی مٹا۔ خیر، جو کچھ ہُوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور ست
بیداد نبود آنچہ بما آسمان دہد

(صاحب عالم مارہروی، ۱۸۵۹ء)

"آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش، حکم، نشتر کا رکھتی ہے۔ اب رگِ قلم کی خوننابہ فشانی دیکھو۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے (پاٹودی، دوجانہ اور لوہارو) اُن کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہ پہنچا۔ جب مَیں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، مَیں اپنی عادتِ قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ (میر منشی) مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ مَیں سمجھا کہ اس

(صفحہ ۱۲۹ سے آگے) غالب کو اس کا علم نہ ہو سکا، یہ سکہ، ذوق کا کہا ہوا تھا ہی نہیں۔ اس لیے پرچے مل جاتے جب بھی یہ سکہ ان میں موجود نہیں تھا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ مُخبر (گوری شنکر) کی یہ اطلاع محض افترا تھا۔ نہ یہ سکہ میرزا نے کہا تھا، نہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا بلکہ یہ سکہ جیسا کہ صادق الاخبار (دہلی) کی اشاعت ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ/ ۶۔ جولائی ۱۸۵۷ء سے عیاں ہے، حافظ غلام رسُول ویران (تلمیذ ذوق) نے لکھا تھا۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۳۴)

"غالب کی طرف جو سکہ منسوب کیا گیا تھا، وُہ ذوق کا نہیں، بلکہ ذوق کے شاگرد حافظ ویران کا تھا، جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہونے کے بعد کہا تھا اور یہ سکہ دہلی کے صادق الاخبار میں "سکۂ نو" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ۔ (صادق الاخبار: ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ) نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) میں "غدر" کی دستاویزیں ہیں جو مخبروں کے خطوط ہیں، اُن میں سے ایک میں گوری شنکر نے یہی سکہ میرزا غالب سے منسوب کیا ہے۔ غالباً اسی خط کی بنا پر غالب پر سکہ کہنے کا الزام لگا تھا۔"

(عتیق صدیقی، غالب اور ابوالکلام، دہلی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۵۴)

وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہُوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط اُن کے نام کا لکھ کر، اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے، اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ٹُلک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہُوا۔ دربار و خلعت موقوف، پنشن مسدود وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ ولا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی، اہالی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ مَیں نے کہا "میں بھی چلوں؟" فرمایا کہ "نہیں۔" جب لشکر میرٹھ سے دلّی میں آیا، موافق اپنے دستور کے، روزِ ورودِ لشکر میرٹھ میں گیا۔ میر مُنشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمے میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ مَیں گدائے مبرم، اِس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ مَیں نے قصیدہ حسبِ معمول قدیم بھیج دیا، مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ مَیں مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور حکّام شہر سے ملنا ترک کیا ——"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہُوا۔ دِلّی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حُکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہُوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سُنتے ہی مَیں سوار ہو کر گیا، میر مُنشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں، یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کرلے آیا ——"

(مجروح، یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

"پرسوں (پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء) پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، بھولو شاہ کی قبر کے سامنے، خیمۂ خاصہ برپا ہُوا اور باقی لشکر تیس ہزاری باغ تک اُترا ہے۔ (میں)... لشکر کو گیا۔ میر مُنشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کہلا بھیجا گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو فُرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی، حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہوگیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید ہے۔ نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنسن۔ اِنّا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون ۰"

(حُسین میرزا، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"سُنو داستان: صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴۔ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ مَیں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵۔ فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پُرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے، جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب، حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پُوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اِس کی حقیقت بیان کی۔ کہا: "ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔" مَیں نے عرض کیا: "کل حاضر کردوں گا۔" پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا ——

دیکھو میر مہدی، حاکمِ پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پُرسش سے کیا مُدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا، مَیں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸، فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا: "اچھا توقف کرو۔" بعد تھوڑی دیر کے... باہر نکلے مَیں نے کہا: "وہ کتابیں حاضر ہیں۔" کہا: "منشی جیون لال کو دے جاؤ۔"... سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا، بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دیکر

یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے "بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر (مجسٹریٹ دہلی) کو کچھ لکھا ہے، تم اُن سے ملو۔ عرض کیا "بہتر۔" اجرٹن صاحب بہادر ۔۔۔۔ گئے ہوئے تھے، کل وہ آئے۔ آج مَیں نے اُن کو خط لِکھا ہے۔ جیسا وہ حکم دیں گے، اُس کے موافق کروں گا۔ جب بُلائیں گے، تب جاؤں گا۔

دیکھو سیّد، اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو، کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکّام سے مجھ کو عزّت دِلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی کا بخشا ہوا تھا، مَیں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟"

(مجروح ، مارچ ۱۸۵۹ء)

"راہ و رسمِ مراسلت، حکّامِ عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے"

(چودھری عبدالغفور سرور ، اپریل ۱۸۶۰ء)

"دلّی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریقِ مددِ خرچ مِل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔۔۔ علی بخش خاں[1] پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں، ان کو چھ سو روپیہ مل گیا، باقی روپیہ چڑھا رہا، آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں[2] سو روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں، اس کو بارہ سو روپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں، اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ مناجاجہ دار دس روپے کا نگہ لمبر، سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مددِ خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے

---

[1] علی بخش خاں، بن الٰہی بخش خاں معروف، میرزا غالب کے برادر نسبتی۔

[2] غلام حسن خاں محو، بن غلام حسین خاں مسرور، جو غالب کے ہم زلف تھے۔

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد ۱، ص ۳۵۳)

نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ مَیں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ مَیں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے، ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا — "

(میر مہدی مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

" میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہٗ سمجھ لو۔ وللرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو اُس کی تعمیل بطرزِ مناسب یہاں ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ مَیں نے کہا: صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرار کا حکم مل جائے گا، اَوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ مَیں چُپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے، دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ پر، یار، ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حُکم تو، اسی حکم کے ساتھ اُس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے، یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب، اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؛ چنانچہ حاکم دہلی نے کتاب یہی کہہ کر مجھ سے مانگی اور مَیں نے دی۔ اب دیکھو، حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے؟ "

(میر مہدی مجروح ، ۷ ؍ مارچ ۱۸۵۹ء)

" پنسن جاری ہو گیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے، مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اِس

حساب سے میرے حصّے میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے ۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"صاحب! میری داستان سُنیے ۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا ۔ زرِ مُجتمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا۔ بعد اَدائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینہ بدستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں، ماہ بماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔"

(علائی، ۸۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

"اب میری کہانی سُنو: آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنسن دارانِ قدیم ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریق ششماہہ، فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہو کار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رامپور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سُود چھ مہینے تک اسی طرح کڑوان دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی۔"

(تفتہ، ۲۰۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

"تنخواہ کی سنو: دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو (روپے) مدد خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اُٹھ گئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ مَیں اس کا قرضدار ہوں، روپے اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا، سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ مَیں نے کہا، میرے قرضِ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے، نو سو بچے، آدھے تو لے، آدھے مجھے دے، وُہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پانچ سو سات تم لو، یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ مَیں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ مَیں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللّٰہی ہے۔ اِن پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللّٰہی ہے۔ حاکمِ شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں، حاکمِ صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے"

(مجروح، مئی ۱۸۶۰ء)

"بعد غدر، بجرمِ مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری برات کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس کے بعد پنسن چھٹا ــــــ"

(حبیب اللہ ذکا، ۱۵۔ فروری ۱۸۶۷ء)

"غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے (تین برس) بعد میرا پنسن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آیندہ کے لیے بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار و خلعت جو معمولی و مقرری تھا، مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ مَیں فقیر متکبر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا ــــــ" (شیو نرائن آرام، ۱۸۶۳ء)

"اب میرا حال سُنو:

در نومیدی بسے اُمید است
پایانِ شب سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر، خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ نااُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مُدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹیننٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، مَیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا، تم بھی اُنبالے جاؤ، شریک ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری؟ گویا مُردہ جی اُٹھا ــــــ"

(تفتہ، ۲۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا۔ خیر، کرو، مجھ کو کیا۔ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ (بیماری کی وجہ سے) ... اُٹھنا دشوار ہے ... بہرحال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو

بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ (بیماری کا) حال عرض کیا گیا۔ فرمایا خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اس پھوڑے کا بُرا ہو۔ انبالے نہ جا سکا —"

(شیونرائن آرام، ۱۸۶۳ء)

"نواب لفٹنٹ گورنر جنرل منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔ بہت عنایت فرمائی۔ ایک شالی رومال سوزن کا اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی، یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ مَیں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے۔ مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے، لارڈ صاحب کے دربار و خلعت میں۔ فرمایا: "اچھا، اچھا" دوسرے دن لارڈ صاحب آئے —— تیسرے دن لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر مَیں نے عرض کیا کہ مَیں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اسلوبی کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا۔ اب یہ، اور دربار اور خلعت بند ہے۔ اِس کا مجھ کو بڑا غم ہے، فرمایا کہ غم نہ کرو۔ تمھارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ مَیں نے اپنا ہاتھ دکھایا کہ حضرت! بوڑھا ہوں اور زخمی ہو گیا ہوں۔ انبالہ کس طرح جاؤں گا؟ —— خیر آئندہ دربار میں پاؤ گے ——۔ مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمھارے دربار و خلعت کے واگزاشت کا حکم دے کر کلکتہ سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں —"

(میرزا عباس بیگ، ۱۲- مئی ۱۸۶۳ء)

"اواخر ماہِ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دِلّی آئے۔ اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ مَیں تو بیگانۂ محض اور مُطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہُوا، ہر ایک کامگار ہُوا۔ شنبہ ۸- فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا، بُلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں —— میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا، وہ بطریقِ حُسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا[1] جب حکام بہ مُجرّدِ

---

[1] صفحہ ۱۳۸ پر ملاحظہ کیجیے:

استدعا مجھ سے بے تکلف ملے، تو میں قیاس کرسکتا ہوں کہ میر منشی کی حُسنِ طلب بہ ایمائے حکام ہوگی، وللرحمان الطاف خفیہ — بقیہ رُوداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکمِ حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہُوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حُکم دفتر میں لکھوا کر چودہ یا پندرہ دن بعد ادھر کو روانہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا سُبحان اللہ:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

سہ شنبہ ۳۔ مارچ کو بارہ بجے لفٹنٹ گورنر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا: "حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب کا حکم سُن لیا، نہال ہوگیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا":

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد
ہرچہ گیرد مختصر گیرید

(غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد غدر دربار اور خلعت اور ملاقات سرکاری کی، یہ سب موقوف۔ اب جو لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، تو اُنہوں نے خود مجھے بُلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی

صفحہ ۱۳۷ سے: "کسی ذریعے سے میرزا غالب کو اطلاع پہنچی ہوگی کہ میر منشی ملاقات کے خواہاں ہیں۔ اسی بنا پر میرزا، لفٹنٹ گورنر پنجاب کی خیمہ گاہ میں پہنچے اور منشی من پھول سنگھ سے ملے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، ص ۴۴۴)

دربار اور خلعت کھُل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ مَیں انبالے نہ جا سکا۔ بالفعل نواب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اُس خلعت کو بشرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا ـــــ"

(میر سرفراز حسین، ۲۷۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"ماجرا یہ ہے کہ مَیں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنسن جاری ہو گیا، لیکن دربار اور خلعت بند۔ اَب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگذاشت ہو گیا، مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ مَیں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمروِ پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ مَیں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آ کر مجھ کو بُلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا ـــــ" (قدر بلگرامی، ۱۸۶۳ء)

"منگل ۳۔ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ "ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا ـــــ" مَیں نے عرض کیا کہ "مَیں انبالے جاؤں؟" فرمایا: "البتہ جانا ہوگا ـــــ"

(نواب یوسف علی خاں، ۱۶۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا غار ہو گیا ہے ـــــ" (تفتہ، ۴۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"واگذاشت کا حکم سُنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی بھی ابھی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی، یعنی نہ میں دربار میں گیا، نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور اَمر ہے، یہ اور بات ہے۔ اِس امر اور اِس بات سے، اُس کو ہرگز علاقہ نہیں۔ اَب مَیں نے ---- چیف سکرتر کو فارسی میں خط بھیجا ہے ---- جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور

جاری میں : دربار، خلعت، خط۔ بعد غدر کے تینوں دستور بند ہوگئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگزاشت کی خبر سُن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب آنے پر دل جمعی کا مدار ہے ــــ"

(میرزا عباس بیگ، ۱۲۔ مئی ۱۸۶۳ء)

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا تو مَیں نے قصیدۂ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا بہ طریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مُراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نوابِ معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں اور یہ دستور قدیم تھا کہ جب مَیں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکام تحت مجھ کو آجاتا ــــــ اَب جو مَیں نے موافقِ معمول، قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ صدائی بَرنخواست۔ نا اُمید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی تو دربار اور خلعت کہاں؛ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا، وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔"

(نواب محمد یوسف علی خاں، ۴۔ اگست ۱۸۶۳ء)

"پیش از غدر گورمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہوگیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل بارہ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباروں کو پہنچ گیا تھا۔ مَیں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہوگی، ایک رباعی کاغذِ مذہّب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم[1]۔ بارے بروقتِ ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کرکے لارڈ صاحب نے

---

[1] "میرزا صاحب کے اِس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اَب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکتِ دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں مرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا۔ اُس کا ایک شعر یہ ہے:

چوبے طلب بمن اینہا رسیدہ است، بود
زبہر مطلبِ خویشم توقعِ امضا!

باقی صفحہ ۱۴۱ پر دیکھیے:

کمڑے کمڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ مالائے مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے: دو شالا، ایک ۔کمخواب کا تھان، ایک بنارسی تھان سنہری بوٹے، ایک ۔بنارسی سیلا، ایک ۔الوان کی چادر کلابتون، ایک ۔کناویز کا تھان، ایک ۔الوان کی چادر بے کنارہ، ایک ــــــ"

(نواب کلب علی خاں، ۱۸۔ دسمبر ۱۸۶۶ء)

"دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ــــــ" (مجروح، ۲۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"مرزا تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں؟ ــــــ"

(تفتہ، ۳۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم --- مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے کہ جس میں، میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک

(صفحہ ۱۴۶ سے آگے) اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب کی قید کیوں لگاتے۔ لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا" ــــــ اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا، کہ انہوں نے کسی مصلحت سے اس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی ــــــ"

(مولانا امتیاز علی عرشی، حواشی مکاتیب غالب، طبع چہارم، ص ۱۸۱)

کمپ ہے ——" (علائی ، ۱۶ - فروری ۱۸۶۲ء)

"اَللہ اَللہ ، دِلّی نہ رہی اور دِلّی والے اَب تک یہاں کی زبان کو اَچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے ، حُسنِ اعتقاد ! اَرے بندۂ خُدا ، اُردو بازار نہ رہا ، اُردو کہاں ؟ دِلّی ، واللہ اب شہر نہیں ہے ، کمپ ہے ، چھاؤنی ہے ۔ نہ قلعہ ، نہ شہر ، نہ بازار ، نہ نہر ——"

(مجروح ، ۱۸۶۰ء)

"مَیں تم کو لکھ چُکا ہوں کہ دِلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے ؟"

(تفتہ ، ۳۱ - جنوری ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر ، اَب شہر نہیں ، قہر ہے ——" (غلام نجف خاں (؟) ۸ار جولائی ۱۸۵۸ء)

"یہاں سے باہر اَندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تُم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مُسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں ——"

(تفتہ ، ۵ - دسمبر ۱۸۵۷ء)

"تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں ، اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا ——"

(مجروح ، ۷ - فروری ۱۸۵۸ء)

"مُسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا ——"

(تفتہ ، ۵ - مارچ ۱۸۵۸ء)

"اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ——"

(مجروح ، ماقبل ۱۸۶۱ء)

"---ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی کس برتے پر تتاپانی؟ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی ——"

(مجروح، ۲۳۔ مئی ۱۸۶۱ء)

"(اب دہلی میں) مسلمان : اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں، کسبیاں ——"

(علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اِس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟"

(مہر، اوائل ۱۸۵۸ء)

"بھائی، لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان ہوگا، نہ اِس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ اُمراء اور شرفا کی حکّام سے ملاقاتیں، بقدر رُتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔ اور ایک نقل سُنو: وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہلِ اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور اُن کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی ——"

(مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ——!"

(سیّاح، ۳۰۔ جون ۱۸۶۰ء)

"رفعِ فتنہ وفساد اور بلاد میں مُسلّم، یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ اُن کی جبینِ حال سے مِٹ نہیں سکتا ــــــ"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"دلّی کے اُمرا، خصوصاً اُمرائے شاہی، ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔"

(یوسف مرزا، ۲۹، نومبر ۱۸۵۹ء)

"دِلّی، اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے اُمرا، نہ اطرافِ شہر کے روسا۔"

(نواب یوسف علی خاں، ۲۶۔ دسمبر ۱۸۶۴ء)

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ ــــــ"

(جنوں، ۲۲۔ فروری ۱۸۶۱ء)

"نہ کہیں جانے کا ٹھکانہ، نہ کوئی میرے پاس آنے والا ــــــ"

(یوسف مرزا، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔"

(تفتہ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"میرن صاحب، کیوں شہر سے باہر ٹھہریں اور کیوں کسی کے بُلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں، یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلّی ماروں کے محلّے میں میرے مکان پر اُتر پڑیں ... ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا ــــــ"

(مجروح، مئی ۱۸۵۸ء)

"ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصول

اجازتِ حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو، اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے ۔۔۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"کہو، کوئی طرح شہر میں تمہارے آنے کی ٹھہری یا نہیں؟ بُعد تیس کوس اور آدھ کوس برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دو جانے میں ہو۔ مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں ہونا، بے اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں، پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمہارے پاس چلا آتا ۔۔۔۔" (غلام نجف خاں، جولائی ۱۸۵۸ء)

"آج بُدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو (میرٹھ سے) آئے ہوئے نواں دن ہے ۔۔۔:

روز اِس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ میری لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جُرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔" (مجروح، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مُرتّب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ: 'اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر، اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔' پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلّے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔" (مجروح، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"واللہ، ڈھونڈے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو

باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں ——"

(تفتہ ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں۔ پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں .... خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر، آج بدھ کا دن ۲۲۔ دسمبر کی ہے اب کے شنبے کو "بڑا دن" اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا ——"

(مجروح ، ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء)

اب یہاں آبادی کے ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ مَیں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرطِ ادخال جُرمانہ"

مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔؟"

(مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

"(آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں، وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔"

(مجروح ، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ، شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں، انہیں ڈھا دو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔"

(مجروح ، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"آبادی یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجوٹن صاحب بہادر (مجسٹریٹ دہلی) بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے ——"

(مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

"اہلِ شہر کی آبادی مسکن، یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریات ریاست ہے۔ یہاں قہرِ الٰہی ہے کہ منشا تباہی ہے۔"

(انورالدولہ شفق، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا، اب امن و امان ہے ——"

(مہر ، ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوتے ہیں۔ کئی ہزار کی بستی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، جلدی کیا ہے۔"

(حسین میرزا ، ۱۸ ۔ جون ۱۸۵۹ء)

"آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر، اور ہتھیار جس پاس ہو، وہ نہ آئے اور باقی ہندو مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے۔ مگر بغیر آبادی کے ٹکٹ کے رات کو رہنے نہ پائے۔"

(یوسف میرزا ، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کے مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے، آئندہ کیا ہو گا ___؟"

(مجروح، ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آ رہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں!"

(حسین میرزا، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مسلمان کی املاک کی واگذاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرائے پر ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے ___"

(مجروح، یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

"شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے، کرایہ دار کا نام نہیں ___"

(یوسف میرزا، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس منضبط رہے۔ یعنائی (لیٹرے)، وگ، لکڑی، تختہ، کواڑ، چوکھٹ، بعض مکانات کی چھت کا مسالہ، سب لے گئے۔ اب ان غرباء کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمت کا مقدور کہاں؟ فرمائیے مکانات کیوں کر نہ گریں؟"

(انوارالدولہ شفق، ۱۱۔ اگست ۱۸۶۲ء)

"حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانیٔ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہو گا، جو اب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ! قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں، کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگیں اڑا دیے گئے ___"

(انوارالدولہ شفق، ۲۴۔ اگست ۱۸۶۰ء)

"آغا باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟"

(یوسف میرزا، ۲۶۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔"

(سیّاح، ۲۔ مئی ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے[1]۔ اگر سچ ہوجائے تو کیا دُور ہے۔ شاہِ اودھ کی املاک بھی واگذاشت کی خبر مشہور ہے[2] ——"

(مجروح، ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ جنوبی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنا لیں۔ انڈا، مُرغی، کبوتر بکنے لگا ہے۔ عشرہ مُبشّرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے: مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں تین یہ، سات اور ——" (مجروح، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۶۲ء)

"کیسی صاحبزادوں کی سی بات کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسی آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی،

---

[1] "۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے جامع شاہجہانی پر بھی قبضہ کر لیا تھا کیوں کہ وہاں سے بھی نمازیوں کے ایک گروہ نے انگریزوں پر شدید حملہ کیا تھا۔ بعض انگریزوں کی یہ تجویز تھی کہ مسجد ڈھا دی جائے، بعض کہتے تھے کہ اسے گرجے میں تبدیل کر دیا جائے۔ کئی سال کے بعد انگریزوں نے اسے واگزار کر دیا اور انتظام کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جس میں انگریز اپنے معتمد علیہ مسلمانوں کو نامزد کرتے ——"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۴)

[2] "یعنی شاہِ اودھ کی وہ املاک جو دہلی میں تھیں، ان کے لیے اودھ سے خاص منتظم مقرر ہو کر دہلی آتا تھا۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں، اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء اللہ خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اُڑتی ہے۔۔۔ لکھمی کی دُکان پر کتے لوٹتے ہیں۔"

(مولوی عزیز الدین ، ۱۸۵۸ء)

"یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار: خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی؟"

(چودھری عبد الغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰)

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ (درس گاہ) دار البقاء فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا، دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے ––––"

(مجروح ، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"چوک (چاندنی) میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے، حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔"

(مجروح ، ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں: ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک (ریلوے لائن) محل، ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے، آثارِ عمارات باقی نہ رہیں گے۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دِلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولہے میں ڈالوں؟"

(یوسف میرزا ، ۲۶۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"وُہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی، کچھ بھی نہ ہُوا۔ مُرپٹ کر ایک جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ——" (یوسف میرزا، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا، سُن جاؤ، غالبِ افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ ——" (مجروح، ۲۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"نیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات، سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم (سول حکام) بچاتے ہیں۔ پایانِ کار دیکھیے کیا ہو ——" (حسین میرزا، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"کشمیری کٹڑا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ کیا اُونچے اُونچے دَر اور وُہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں ——؟" (مجروح، سنم جنوری ۱۸۶۰ء)

"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے۔ مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اِس فساد کے ایک کون ہو گا (بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی)، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا، وہ داد دے گا —— اور دِلّی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت، سوائے اُس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے، شہر کے لاہوری دروازے تک ہے سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے ——" (میاں داد خاں سیاح، ۱۱؍ جون ۱۸۶۰ء)

"کھاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مُبالغہ ایک صحرا لق و دق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے —— یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وُہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ

کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا پنجابی کٹڑا، دھوبی واڑا، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹڑا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا ——"

(مجروح، ۱۸۶۱ء)

"(ان دنوں) شہر چُپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلی شہر، شہرِ خوشاں ہے ——"

(مجروح، ۲۲۔ ستمبر ۱۸۶۱)

○○

"غلے کی گرانی، آفتِ آسمانی ——" (انور الدولہ شفق، ۲۴۔ اگست ۱۸۶۰)

"غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی ——"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"گرانی اور ارزانی اُمورِ عامّہ میں سے ہے۔ دُنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں ——" (چودھری عبدالغفور سرور، نومبر ۱۸۶۰ء)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں —— سوائے ساہو کاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس (اخبار کی خریداری) کی طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم اِدھر کا خیال دل سے دھو ڈالو ——"

(شیو نرائن آرام، ۱۲۔ جون ۱۸۵۹ء)

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے، کاغذ (بطور اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے ——"

(شیو نراین آرام ۰ ۱۸۵۸ء)

"مہر کے واسطے صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر پنچے کی وال کے برابر اور ہشت پہلو، اِس اُجڑے شہر میں کہاں ملے گا —— ؟" (شیو نراین آرام، ۱۸۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بادشاہ (ظفر) کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مُصوّروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی، بعد اپنے گھروں کے لُٹنے کے آباد ہوئے ہیں، تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مُصوّر کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کر دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔۔۔۔ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مُصوّروں سے خرید کرنے کا نہ مجھ میں مقدور، نہ تمہارا نقصان منظور ——"

(شیو نراین آرام، ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"دِلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لُوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے ——"

(میر مہدی مجروح، ۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء)

"دہلی کی ایجنٹی کا دفتر فرد فرد لُٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا ——"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری یا مارچ ۱۸۵۹ء)

"دِلّی علاقہ لفٹنٹ گورنر سے اِنقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحتِ حکومت آگئی ——"

(انور الدولہ شفق، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹننٹ گورنر بہادر یہاں کا حدّ ٹھہرا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری مارچ ۵۹ء)

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے کا کہ دِلّی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطے میں شامل ہے۔ نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"قواعد عملداری کے برہم ہو گئے، نئے نئے دستور ہیں —"

(مجروح ، ۱۸۶۳ء)

"نہ وہ حکام ہیں، جن کو مَیں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ ہے جس سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس مَیں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ "یا حافظ"۔ "یا حفیظ" وردِ زبان ہے —"

(کاشف ، ۱۳۔ مئی ۱۸۶۳ء)

"ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنسن کی منظوری کی رپورٹ آگئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپیہ مہینا پانے والیوں کو حکم ہُوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مُجرم تھے، تمہاری پنسن ضبط! بطریقِ ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہو گا؟! مَیں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پرتم نہیں الجھ سکتا۔ ترپن برس کا پنسن، تقرر اکس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا —"

(یوسف مرزا ، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"ایک لطیفہ پرسوں کا سُنو: حافظ مُمّو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر —— پرسوں وہ

حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا:

"حافظ محمد بخش کون؟"

عرض کیا کہ: "میں"

پھر پوچھا کہ: "حافظ ممّوں کون؟"

عرض کیا کہ: "میں، اصل نام میرا محمد بخش ہے، مگر ممّو مشہور ہوں۔"

فرمایا کہ: "یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دُنیا میں ہے، وہ بھی تم، ہم مکان کس کو دیں؟

مثل، داخلِ دفتر ہوئی، میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے ——"

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

۵

جو تدبیر وثیقے[۱] کے باب میں تم نے کی ہے، وہ بہت مناسب ہے، بشرطِ پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے، سجاد میرزا اور اکبر میرزا اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے[۲]۔ انشاء اللہ العلی العظیم"

---

[۱] "وثیقے کی کیفیت یہ ہے کہ شاہان و بیگمات اودھ کا ایک دستور یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو ہندوستان کے مختلف حصّوں پر مُسلط ہو چکی تھی، بڑی بڑی رقمیں بطور قرض دے دیتے اور ان کے سود کی رقم اپنے عزیزوں، متوسلوں یا مُلازموں کے نام لکھ دیتے تھے۔ کمپنی کی حکومت کے خزانے سے سود کی رقمیں مُقررہ لوگوں کو ملتی رہتیں۔ حسین میرزا اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں کے لیے بھی وثیقے مقرر تھے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضبط ہو گئے۔ مُظفر الدولہ بیچارے تو الور سے پکڑے آئے اور اُس گروہ کے ساتھ شہید کر دیے گئے، جنہیں مقدمہ چلائے اور تحقیق کیے بغیر گوڑ گانوہ میں شہید کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حُسین میرزا وثیقے کی بحالی کے لیے مُقدمہ، ولایت تک لے جانا چاہتے تھے۔ یقیناً اُنہیں اس کا پُورا حق حاصل تھا، کیوں کہ وثیقہ، قرض دی ہوئی رقم کا سود تھا، یا رقم واپس ملتی یا سود ادا ہوتا رہتا۔ یہ انگریزوں کا عطیہ نہ تھا کہ اسے ضبط کر لینا جائز ہوتا۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب (جلد دوم)، ۱۹۶۹ء ص ۶۰۹)

[۲] "میرزا غالب نے لکھا ہے کہ بے شک، مقدمہ دائر کر دو، لیکن نتیجہ شاید اس وقت برآمد ہو، جب آپ کے فرزند (سجاد میرزا اور اکبر میرزا) بوڑھے ہو جائیں گے ——" (مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

"جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو، وہ اصل کہاں ہے، جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اُس کے خلاف ہے ــــــ"

(یوسف مرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"ہمشیر کی درخواست کیوں کر گزرے؟ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستانِ ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہو گا۔ کیوں کر اس ویرانے میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبراختیار کر لیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہر حال ۔۔۔۔ نقلِ حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ اُمور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حُکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت ــــــ"

(حسین مرزا، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی فضلو ۔۔۔ آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے ہیں، عرضیاں دیتے پھرتے ہیں، کوئی سنتا نہیں ــ"

(یوسف مرزا، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے ۔۔۔۔ کیسی نقلِ حکم، کیسا مرافعہ، جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکامِ قضا و قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں ــ"

(حسین مرزا، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال، کالوں نے لُوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہو گا، یعنی ہزار روپیہ مانگنے والے کو سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے، وہ ہدر اور بحل (مباح اور معاف) ہے، اس کا معاوضہ نہ ہو گا ــــــ"

(حسین مرزا، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں

روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اِس مہینے میں برابر وہی صورت رہی، آج ۲۷۔ ۰ پر کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔"
(مجروح ، ۲۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء)

یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"
(مجروح ، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی (ٹاؤن ڈیوٹی = محصول چونگی) کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں ۷۔ نومبر کو جاری ہو گئی ... غلّے اور اُپلے کے سوا، کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو ——"
(حسین مرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو ——"
(مجروح ، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"سُنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ (الور) کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا، جیسا خُدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے ——"

(مجروح ، ۲۶۔ ستمبر ۱۸۶۲ء)

"حضرت، یہاں دو (ایک) چیزیں مشہور ہیں۔ اُن کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں ... لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ سچ ہونا (اس) کا آپ کے خط لکھنے پر منحصر ہے"

(مہر ، ۲۱۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حکم ہوا ہے کہ دوشنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھکر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے ——"

(آرام ، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر کو (دوشنبے) کے دن حسب الحکم حکام، کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکۂ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں:

تا نہال دوستی کے بردہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

(انور الدولہ شفق ، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

"حکمِ عفوِ تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں ——" (تفتہ ، ۲۰ - نومبر ۱۸۵۸ء)

O

"صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی۔۔۔ میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دِلّی اور اُس محلّے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔"

(تفتہ ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"اس چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں

رکھتے تھے۔ ایک گوشہ وتوشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ، ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے :

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا ، اُے فلک !
اور تو یاں کچھ نہ تھا ، ایک مگر دیکھنا

(مجروح ، اپریل ۱۸۵۹ء)

" درخت جگہ سے اکھڑکر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں ، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے ؟ سُنی الگ ، شیعہ الگ ، نیک جُدا ، بد جُدا ! "

(مجروح ، ۷۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

" وہی بالاخانہ ہے اور وہی مَیں ہوں ۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے ، وہ یوسف میرزا آئے ، وہ میرن آئے ، وہ یوسف علی خاں آئے ۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا ، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں ۔ اللہ ، اللہ ، اللہ ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں ، مَیں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا ۔؟ ---- کیا مجمع برہم ہوا ہے ! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے —— "

(میر سرفراز حسین ، ۱۸۵۸ء)

" تمہارا شہر میں ہونا ، موجب تقویتِ دل تھا ۔ گو ، نہ ملتے تھے ، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے ۔ بھائی ! ایک سیر دیکھ رہا ہوں ۔ کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح ، ہر طرف اُڑتے پھرتے ہیں ۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں —— "

(نواب امین الدین احمد خاں ، ۲۲۔ جون ۱۸۶۴ء)

" آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں ۔ عقل جاتی رہتی ہے ۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے ، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے ۔ پوچھو کہ غم کیا ہے : غمِ مرگ ، غمِ فراق ، غمِ رزق ، غمِ عزت ... غمِ فراق حسین میرزا ، میر مہدی ، میر سرفراز حسین ، میرن صاحب ، خدا ان کو جیتا رکھے ۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے ، وہاں خوش ہوتے ! گھر ان کے بے چراغ ، وہ خود آوارہ ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے ۔ "

(یوسف میرزا ، ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرن صاحب کو، جب تک تم کہو، مَیں دِلّی نہ بلاؤں، گویا اُن کے عاشق تمہیں ہو، مَیں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ، غور کرو یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ اُن کو یہاں بُلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہیں تو تیس روپے مہینہ مقرر کر دوں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوراں خان کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اَے میر مہدی! تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دِلّی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جانگداز کی تاب لاؤں؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ مَیں نے کیا کیا:

اَے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

(مجروح، ۸۔ دسمبر ۱۸۶۰ء)

"غم مرگ میں قلعۂ نامُبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، اُنیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں، مُرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا مَیں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؛ اے لو، بھول گیا: حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ، ان کو کہاں سے لاؤں؛ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر مَیں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ——"

(یوسف میرزا، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"احمد حُسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؛ مخنوق ہُوا (پھانسی پائی)۔ گویا، اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں ——" (غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"طالع یار خاں کے دو بیٹے رُخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جا سکے، یہیں رہے۔ بعد فتحِ دہلی، دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مُردے سے بدتر ہوں گے ——" (انوار الدولہ شفق ۱۸۶۰ء)

"ہے ہے، کیوں کر لکھوں؛ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں

ان کے چھوٹے بھائی، اُسی دن مارے گئے ۔۔۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی ـــــ"

(انور الدولہ شفق ، ۱۸۶۰ء)

"اُمرائے اسلام میں سے اَموات گنو: حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ خوار بن کر نامُرادانہ مرگیا۔ میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سُلطان، بخشی محمد علی کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا ـــ"

(علائی ، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"ہائے میرجان جاکوب[1]، کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ پرور! یہ بھی اُنہیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مرگئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔"

(مہر ، اوائل ۱۸۵۸ء)

"انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں نہ دُشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون۔"

(تفتہ ، ۱۸۵۸)

---

[1] "میجر جان کوب، اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی میں وارد ہوئے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب نے رفاقتِ قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا اور نواب صاحب ضیاء الدین خاں کے مکان میں جو پہلے ہی سے مہمان داری کا انتظام کیا گیا تھا، ٹھہرایا۔ دو دن کے بعد میجر صاحب نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر و مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔"
سراج الاخبار، دہلی: احسن الاخبار، دہلی ۱۴۔ ماہ دسمبر ۱۸۴۳ء (بحوالہ: حسن نظامی، بہادر شاہ کا روزنامچہ، طبع پنجم اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۲)

"اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہو گا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست، اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو ——"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مولانا (فضل حق خیرآبادی[1]) کا حال ——— کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا، ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا، سو ہو لیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون o

(یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

"ہاں خاں صاحب! اب جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے (انڈیمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے ——" (میاں داد خاں سیاح، ۴۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء)

"مولوی صدر الدین صاحب (آزردہ) بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی، اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، کرائے پر معاش کا مدار ہے ——"

(احمد حسن مودودی، ۱۹۔ جنوری ۱۸۶۲ء)

- مصطفیٰ خاں (شیفتہ): جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کے بے بنیاد الزام پر سات سال

---

[1] "مولانا فضل حق خیرآبادی جن پر غلطی سے ایک ہم نام کے دھوکے میں مقدمہ قائم ہوا اور جنہیں دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل کی گئی مگر حکم سزا بحال رہا اور تاکید کی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان بھیج دیا جائے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۱۲)

قید کی سزا دی گئی) کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعے میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبس ہفت سالہ گئی تاب اس نازپروردہ میں کہاں ؟" (غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہوگئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ یہ مجرد استماع اس خبر کے، ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔"

(مجروح، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"مصطفیٰ خاں (شیفتہ) کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنسن ضبط —"

(یوسف میرزا، ۱۹۔ مئی ۱۸۶۰ء)

"کل یوسف میرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں، حرف نواب جان، والدان کا دائم الحبس ہوگیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی۔ یوسف میرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا، خدا کرے اُس نے جھوٹ سنا ہو۔" (مجروح، اپریل ۱۸۵۹ء)

"مبارک ہو کہ حکیم صاحب (احسن اللہ خاں)[1] پرسے، وہ سپاہی، جو اُن کے اُوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہوگیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔۔۔۔ صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اُس کی زبانی ہے۔"

(غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

---

[1] "حکمت مآب، کمالات اکتساب، جامع نفائس علوم، مبانی مفہوم، حاکم، محاکم حکم حکیم سیادم محمد احسن اللہ خاں المخاطب بخطاب احترام الدولہ، عمدۃ الحکماء، معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ۔"

(سر سید احمد خاں۔ آثار الصنادید، طبع اوّل: مطبع سید الاخبار ۲۷-۱۸۴۶ء، باب چوتھا)

"حکیم احسن اللہ خاں ۱۸۵۷ء میں درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔" دیکھیے:

(غالب اور ابوالکلام، دہلی، ۱۹۶۹ء ص ۱۶۸-۱۶۷)

"حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر ازراہِ احتیاط جا نہیں سکتا ـــــ"

(غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

"جناب حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) ایک روز ازراہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ اُن کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا اُن کو زندہ رکھے ـــــ"

(غُلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر اُن کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں۔۔۔ ایک انگریز اُترا ہوا ہے۔ پینتیس روپے مہینہ اُن کو کرایہ دیتا ہے۔۔۔ احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا، خود جہاں اصطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں ـــــ"

(حسین میرزا، ۲۸۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خاں) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔۔۔ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں ـــــ"

(تفتہ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹)

"حامد علی خاں[۱] کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی ـــــ"

(مجروح، ۲۲۔ ستمبر ۱۸۶۱ء)

"نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض میں کرائے کے مکانات میں

---

[۱] "حامد علی خاں، میرزا غالب کے عزیز دوست اور اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ بیگم حامد علی خاں کو باپ کے ترکے سے نو لاکھ روپے ملے تھے۔ نواب لکھنؤ کے اُمراء میں محسوب تھے۔ اعتماد الدولہ کے انتقال پر حامد علی خاں دہلی آ گئے۔ روپیہ شاہی خزانے میں جمع کرا دیا۔ اس کا سود ساڑھے چار ہزار ماہوار ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے کسی قدر نجات ملی تو شاہی خزانے میں جمع کرائے ہوئے روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ڈگری اسی سلسلے میں ہوئی، غالباً باقی روپیہ وہ پہلے لے چکے ہوں گے۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹۲)

مع متوسل کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں ـــــــ"

(حسین میرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتا سر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ وخشت کو نیلام کر کے روپیہ داخلِ خزانہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بِکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ ومقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے ـــــ؟"

(حسین میرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ناظر حسین میرزا : ... اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان، اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے ـــــ" (علائی ، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"ہے ہے خسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے!"

(یوسف میرزا ، ۲۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"حال، صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگ گئے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سالِ گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے اُن کی صفائی ہو گئی۔ لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مُغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ، اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا ـــــ"

(انور الدولہ شفق ، ۱۸۶۰ء)

ؔ معین الدولہ، عمدۃ الامراء، صفدر الملک، ذوالفقار الدین حیدر نظامت خاں بہادر ذوالفقار جنگ۔

"بڈھے[1] صاحب، ساری املاک بیچ کر، نوشِ جان کرکے، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔"

(علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"ضیاء[2] الدولہ کی پانسو روپے کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر، پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے ــــ" (علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"تمہارے ماموں۔۔۔ کی جاداد کی واگذاشت کا حکم تو ہو گیا ہے۔۔۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے... ہو گا کیا؟ اگر جادادیں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لیں گے ــــ"

(یوسف میرزا، ۱۹۔ مئی ۱۸۶۰ء)

"روپے کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جانگزا ہے، پر بموجب "تلف المال خلف العمر" عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا، اُس کو عمر میں قیمت جانیے اور اثباتِ ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیے۔"

(انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"ہاں، غلام فخر الدین[3] خاں کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔ خُدا تم کو مبارک کرے ــــ"

(غُلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

---

[1] "بڈھے صاحب کا نام غلام محی الدین تھا اور نواب تھے۔ دہلی کے سرکردہ رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ ایک ہزار روپے ماہوار پنشن تھی۔ تین سو روپے ریاست بھرپور سے ملتے تھے اور پانسو روپیہ ماہانہ کرایہ آتا تھا ــــ"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۶۷)

[2] "رکن الدولہ کے فرزند۔ یہ بھی بڑے رئیس تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد پانی پت چلے گئے تھے، وہاں سے پکڑے آئے ــــ" (مولانا غلام رسُول مہر، ایضاً ص ۲۶۷)

[3] "میرزا غالب کے برادرِ نسبتی علی بخش خاں کے فرزند اور مرزا غالب کی بھتیجی عزیز النساء بیگم کے شوہر۔ وہ اس لیے معرضِ بازپرس میں آ گئے تھے کہ بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم و مہتمم تھے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء صفحہ ۵۰۲)

"یہ دوسرا حادثہ، مجھ کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ قضا و قدر کے اُمور میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جائے تا کہ سب یک جا باہم آرام سے رہو ـــــ"

(ثاقب ، مارچ ۱۸۵۸ء)

"امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال... کیونکر لکھوں)... اُن کو جاگیر اگست میں ملی ـــــ"

(مجروح ، ۱۸۵۸ء)

"سُنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے، خدا سب کا بھلا کرے ـــــ" (غلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

○

"نواب گورنر جنرل بہادر، ۱۵۔ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے (دہلی کے آس پاس سے سات چھوٹی چھوٹی ریاستیں) کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں[2]۔ جو باقی رہے، اُس میں دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں (دوجانہ و لوہارو) کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ

---

[1] "ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر اہل دہلی شہر چھوڑ کر نکلے تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نے لوہارو کا قصد کیا، مہرولی پہنچے تو ان کا سامان لوٹا گیا۔ دہلی میں ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی تھی۔ وہ دوجانہ پہنچے تو وہاں سے پکڑے آئے اور خاصی مدت انگریزوں کی حراست میں لال قلعے کے اندر گزاری۔ آخر بیگناہ ثابت ہوئے اور انہیں جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد لوہارو جانے کی اجازت ملی ـــ"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹، صفحہ ۳۱۹)

[2] "(چار:) جھجرّ، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور فرخ نگر۔ جھجرّ کے نواب عبدالرحمٰن خاں، بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ اور فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو بے گناہ پھانسی دے دی گئی اور اُن کی ریاستیں ضبطی میں آئیں۔ بہادر گڑھ کے رئیس بہادر جنگ کی ریاست ضبط ہوگئی اور انہیں پنشن دے کر لاہور بھیج دیا گیا ـــ"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالبؔ جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۶۸)

ایک رئیس —— دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

(مجروح، ۲۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"قصّہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ (اس) باب میں جو حرفِ مختصر مَیں نے لکھا ہے، اس کو ۔۔۔۔ سچ جانو ——"

(علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں[1] کے حال پر اور رئیس فرخ آباد[2] پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"

(علائی، ۱۹۔ جون ۱۸۶۲ء)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں[3]، نواب حامد علی خاں،

ل "وہ لوگ جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی بنا پر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا ——"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد اول، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۷۲)

ل "نواب تفضّل حسین خاں، رئیس فرخ آباد۔ ان پر بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کا الزام لگا تھا اور ریاست ضبط کرلی گئی تھی۔ نواب کو، اُن کی خواہش کے مطابق حجاز بھیج دیا گیا۔ ان کی زندگی کے باقی دن مکۂ مکرمہ میں بسر ہوئے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۲۷۲)

۔ ٣ے "نجابت علی خاں والیٔ جھجر کے چھوٹے بیٹے۔ اپنے بڑے بھائی نواب فیض محمد خاں کے عہدِ حکومت (باقی صفحہ ۱۶۹)

حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ مہنذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے (اخبار) "آفتاب عالمتاب" کی خریداری کرلی ہے۔ اب وہ مکرر "حالاتِ دربارِ شاہی" کیوں لیں گے؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اِس طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال، دل سے دھو ڈالو ——"

(آرام، ۱۲۔ جون ۱۸۵۹ء)

"معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور رجو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں ——"

(علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"(یہ حقیقت) جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں ——"

(تفتہ، ۹۔ اپریل ۱۸۶۱ء)

"تاج محل (بہادر شاہ کی ایک بیگم)، مرزا قیصر (شاہ عالم ثانی کے چھوٹے بھائی، میرزا سلیمان شکوہ کے فرزند) مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ سے چپوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی ہے۔"[1]

(مجروح، ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"بادشاہ (ظفر) کی روانگی کا حال کیا لکھوں۔۔۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔" (مجروح، ۱۸۵۸ء)

(صفحہ ۱۶۸ سے آگے:) میں جرنیل کے عہدے پر مامور رہے۔۔۔ (مسند نشینی کے موقع پر) اختلافات شروع ہوگئے۔ آخر کار سرکار انگلشیہ نے تصفیہ کرایا۔ حسن علی خاں کے لیے تین ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی جو ریزیڈنسی کی معرفت ملتی تھی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان پر بھی بڑی آفتیں نازل ہوئیں۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹۲)

[1] "مطلب یہ کہ انہیں اجازت مل گئی۔ چاہیں، ہندوستان میں رہیں، چاہیں بادشاہ کے ساتھ جائیں۔"
(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۳۴۷)

" بادشاہ ، میرزا جواں بخت ، میرزا عباس شاہ (بہادر شاہ ظفر کے ایک فرزند جو جواں بخت سے چھوٹے تھے) ، زینت محل ، کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیپ[1] میں رہیں یا لندن جائیں ــــ" (مجروح ، ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء)

" میرزا الٰہی بخش[2] جو شہزادوں میں ہیں ، اُن کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں ، دیکھیے کیا ہو ؟ ــــ" (تفتہ ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

" میرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ اُنہوں نے زمین پکڑی ہے۔ سُلطان جی میں رہتے ہیں ، عُذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبراً اُٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں ــــ" (حسین میرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

" اَودھ اخبار " میں بادشاہ کے مرنے کی خبر دیکھی ، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی ۔" (مجروح ، ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۲ء)

" ۷۔ نومبر / ۱۴۔ جمادی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے آزاد ہو گئے ۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون ؕ " (مجروح ، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۶۲ء)

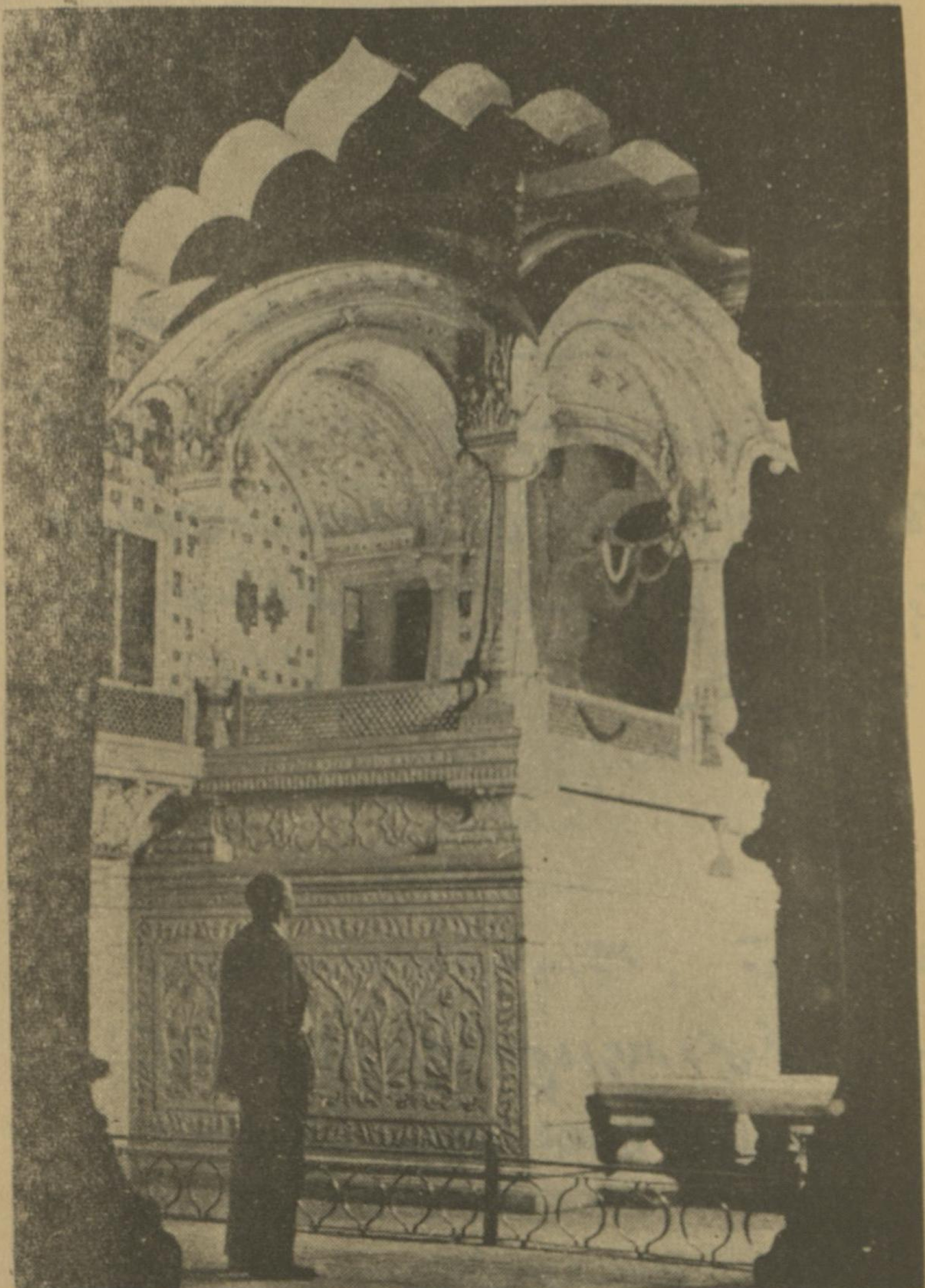
۵

---

[1] " کیپ سے بہ ظاہر مراد (کیپ آف گڈ ہوپ) یعنی " راس اُمید " ہے ، جو برّاعظم افریقہ کے انتہائی جنوبی گوشے میں واقع ہے۔ اس زمانے میں ولایت جانے والے جہاز عموماً راس اُمید کا چکر لگا کر اوقیانوس میں داخل ہوتے تھے۔ اِس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں افواہ گرم تھی ، بادشاہ کو یا تو راس امید میں رکھیں گے یا ولایت لے جائیں گے لیکن اس مظلوم کو رنگون میں رکھا گیا ــــ" (مولانا غلام رسول مہر ، خطوطِ غالب ، جلد اوّل ، ۱۹۶۹ء ، صفحہ ۲۴۷)

[2] " بہادر شاہ ثانی کے دوسرے ولی عہد مرزا فخرو کی شادی ، مرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے ہوئی اور شہزادہ ابوبکر اسی کے بطن سے تھا جسے ہاڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے پاس گولی مار دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میرزا الٰہی بخش انگریزوں کا مخبر بنا رہا۔ اسی کے مشورے کے مطابق بہادر شاہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کیا تھا اور خاندانِ شاہی کے اکثر افراد انتہائی بے دردی سے مارے گئے تھے ، بعد میں میرزا الٰہی بخش کو تیموری خاندان کا سرخیل مان لیا گیا اور پنشن ملتی رہی ــــ"

(مولانا غلام رسول مہر ، ایضاً ، صفحہ ۹۶)



لال قلعہ دہلی : جہاں کبھی غالب کے شعر گونجا کرتے تھے

"--- بعد غدر، ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا۔"

--- غالب

بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی اردو سراسر دیکھا ہوا میرا جو اردو نظم کا بجائے نسخہ

میں تھا غدر میں لٹ گیا بعد غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا فارسی

غزلیں فارسی ہند جو لکھی ہیں اوسکا انتخاب بھی پہنچیگا سے تم سلامت رہو ہزار

برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

نواب کلب علی خاں کے نام غالب کا خط مورخہ ۱۸- دسمبر ۱۸۶۶ء :

پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں پارچہ اور جیغہ سرپیچ مالائے مروارید تین رقمیں جواہر کی مجکو

ملتی تھیں بعد غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔

اِنقلاب ۱۸۵۷ء اور غالب کا شعری رویّہ

" اِنقلاب ۱۸۵۷ء کی غارت گری کے اِس الیمے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔"

—— ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

"فتح دہلی کے بعد جو عالم گیر و عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پر نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہاں آباد کی اُن سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبِ قرانِ اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظرِ خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دارالخلافے کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں:

فلا تسئلن عما جرىٰ یوم حصرہم
وذالک مما لیس یدخل فی حصر[۱]

علی الخصوص قلعۂ معلّٰی کی بربادیاں جن کے لیے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشک بار ہو جائیں اور جن کے غم میں آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی اُن کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجسادِ محترمہ در فیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم و صاحبِ قرانِ ثانی کے خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے، جنہوں نے چھ صدیوں سے متصل شہنشاہی و فرماں روائی کی گود میں پرورش پائی تھی، جنہیں حکومت و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصوّر بھی نہیں ہوا تھا، اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے سَر بسجود پاتے تھے ——— کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اُس عظمتِ رفتہ کا ماتم سنائیں، جو چند روز پیشتر دنیا میں صرف ان ہی کے لیے تھی ......

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے، اور دیکھتے رہے۔ یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں، ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں[۲] ———"

مولانا ابوالکلام آزاد

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بہت سخت واقعہ سہی، لیکن ہمارے ادبی اور تہذیبی اُفق کا یہ المیہ بھی بجائے خود کچھ کم تلخ حقیقت نہیں کہ "مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر" نے "یہ سب کچھ دیکھا"، لیکن یہ سب کچھ اُن کا شعری تجربہ نہیں بن پایا۔

○

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصانیفِ نظم و نثر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ

---

[۱] ترجمہ "ان کی محصوری کے دن جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں نہ پوچھو۔ یہ وہ امور ہیں جو شمار میں نہیں آ سکتے ہیں۔"

[۲] الہلال کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء بحوالہ، غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۵۹ - ۶۱

خونیں) پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلا تیار ہو جائے ...[1] "

فارسی نثر میں اس موضوع پر غالب کی ایک مستقل کتاب ہے۔ " دستنبو " یہ سراسر انگریز حکام کی تائید و تحسین میں ہے اور ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی ہے، اس لیے اس کے مندرجات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انگریزوں سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔ فارسی نظم میں غالب کا آخری مجموعہ "سبد چین" مطبع محمدی، دہلی سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / اگست ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ، غالب کے ان فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو "کلیاتِ غالب" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد موزوں ہوئے۔ چالیس صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں دو قصیدے، ایک ترجیع بند، چھ قطعات، تین رباعیاں اور مفرد اشعار کا اسّی فیصد سے متجاوز حصہ انگریز حکام کی شان میں ہے۔ حامد الہندی نے ٹھیک کہا ہے کہ :

" غالب کی ان قصیدہ خوانیوں کے مقصد کو پانا کچھ مشکل نہیں۔ غالب، ایک بڑے شاعر تھے۔ دلّی کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا، وہ بہادر شاہ کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی نظر میں ان کا مشتبہ ہونا کچھ بعید نہ تھا .... غالب کے لیے ضروری تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کرتے جس سے انگریزوں کے دل سے، اس شک و شبہ کو دور کرنے میں مدد ملتی اور اس کے لیے قصیدوں سے اچھا اور کون سا ذریعہ ہو سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے یہ قصیدے لکھے اور ان کو خاص اہتمام سے شائع بھی کیا۔ اس طرح "سبد چیں" کو غالب کی فارسی شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے، جو اُن کی فارسی نثر میں "دستنبو" کو ....[2] "

یہ دونوں کتابیں تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہیں، لیکن حاسۂ ملّی سے خالی ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے دلّی کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

روز اِس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

یہ شعر، غالب کے انتقال سے کوئی ساڑھے تین ماہ پہلے "عودِ ہندی" میں شائع ہوا (عود ہندی،

---

[1] ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۳

[2] شاعر ، بمبئی ، فروری مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۲۱

طبع اوّل، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۲۷۔ اکتوبر ۱۸۶۸ء صفحہ ۸۲) اس واقعاتی شعر کے علاوہ، جو دیوانِ غالب سے خارج ہے، اردو نظم میں، غالب کے ہاں واقعۂ ستاون سے متعلق محض ایک نو شعری قطعہ ملتا ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام علائی میں محفوظ ہے:

بسکہ فعّال ما یُرید ہے آج | ہر سلحشور[1] انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے | زہرہ، ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے | گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک | تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک | آدمی، واں نہ جا سکے یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ | سوزشِ داغہای پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم | ماجرا دیدہ ہای گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب | کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۷ء کے بعد غالب کا اردو دیوان، ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوا[3]، لیکن اس قطعے کو دیوان کی کسی اشاعت میں جگہ نہیں ملی۔ یہ قطعہ اُن کے انتقال کے معاً بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں، "اردوئے معلّٰی[4]" کے ذریعے پہلی بار سامنے آیا ——— اس ایک استثنے کے علاوہ، غالب کے کلام میں ہمیں ۱۸۵۷ء کے دل دوز سانحے کا کوئی تاثر یا احساس نہیں ملتا ——— اور یہ اتنی غیر معمولی بات تھی کہ خود غالب کی زندگی میں سوال بن کر زبان پر آگئی تھی۔ غالب نے اس کا اچھا جواز پیش کیا ہے:

"ارے بھئی! مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجئے تو دو کا کیجئے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے[5]......"

"وفورِ احساس" بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے، اسے بے بضاعتی اور بے حسی یا لاتعلقی سے بھی

۱؎ مختارِ کل

۲؎ سپاہی

۳؎ تفصیل کیلئے دیکھئے: اشاریۂ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۷۹ — ۸۳

۴؎ اردوئے معلّٰی، طبع اوّل: اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۰۴

۵؎ سیر دہلی، شیخ محمد ریاض الدین امجد، مطبع حیدری، آگرہ ۱۸۶۱ء، صفحہ ۴۴۔ بحوالہ احوالِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۷۴

تعبیر کیا جاسکتا ہے، سبب خواہ کچھ بھی ہوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ، غالب کے ہاں شعری تجربہ نہیں بنا ـــــ انقلاب کے زمانے میں اور اس کے بعد تا آخر، غالب کا ردِ یہ جد وجہد آزادی سے کسی جذباتی لگاؤ کو ظاہر نہیں کرتا ـــــ اس صورتِ حال میں طرف دارانِ غالب کی یہ "وکالت" کچھ حقیقت نہیں رکھتی کہ گو غالب نے:

"۱۸۵۷ء کی تباہی پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن متفرق طور پر ان کے کلام میں..... اس داستانِ الم کی جو تفاصیل اور اشارات ملتے ہیں، وہ کسی پُر درد مرثیے سے کم نہیں اور یہ اشارات اتنے واضح اور تفاصیل اتنی کافی ہیں کہ ہم مرثیے کے عدم وجود کا شکوہ نہیں کر سکتے [۱] ـــــ"

۱۸۵۷ء کے بعد سے غالب کے آخر عمر تک کے کلام پر نظر ڈالیے تو اس میں ہمیں ستاون کی داستانِ الم کا کچھ انعکاس نہیں ملتا ـــــ نہ کوئی داد، نہ اس کی طرف اشارہ، نہ اس کی کوئی تفصیل۔ "فتنہ و فساد" کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ذوقِ شعر، گویا جاتا رہا اور شعر گوئی، ایک طرح سے ترک ہی کر دی، لیکن کچھ کہا تو اپنی مدافعت اور نئے نظام کی مدحت میں!

○

"دلّی کا وہ ادبی حلقہ جس کو مرزا غالب سے ذہنی اور فنی بیر تھا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں پیش پیش رہا ـــــ مولوی محمد باقر، ایڈیٹر "اردو اخبار" دہلی ـــــ جنہوں نے ۱۸۴۷ء میں مرزا کی گرفتاری پر بغلیں بجائی تھیں اور کوتوال کی حمایت کی تھی، مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو برطانوی اقتدار کا خاتمہ اور مغل شہنشاہی کی بحالی سمجھ رہے تھے ـــــ پھر یہ کہ باغی فوج میں تنظیم کی کمی، سر شوری کی زیادتی اور ان انگریزوں کا قتلِ عام، جن میں سے کوئی غالب کا دوست کا تھا، کوئی امید گاہ تھا، کوئی قدر دان تھا، کوئی مُربّی تھا ـــــ اور اس کے سوا یہ بھی کہ غالب کو نظر آرہا تھا کہ آخر یہ بغاوت یا جنگِ آزادی، خود اپنی کمزوریوں کی بنا پر ناکام ہونے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے در پردہ اپنے ایک دوست اور امید گاہ والئ رامپور کو جو خفیہ خط لکھے اور سیاسی مشورے دیے، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کو باغیوں سے ویسی ہمدردی نہ تھی جیسی اُن کے طبقے کے دوسرے سر برآوردہ لوگوں کو رہی۔ چنانچہ ہندوستانی تاریخ کے اس عظیم الشان واقعے پر جو آنسو ہم ان کی تحریروں سے ٹپکتے ہیں، اُن میں غم تو ہے آگ نہیں ہے، مرنے والوں سے چاہے وہ کالے ہوں یا

---

[۱] ابوسلمان شاہجہاں پوری، "العلم"، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۰۵

گورے اور کٹنے والوں سے چاہے، وہ غریب ہو یا امیر، ان کو گہری ہمدردی ہے۔ تام سب کا ہے لیکن کسی فریق کی حمایت یا تائید بالاعلان نظر نہیں آتی[۱]......"

—— ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کے تعلقات: "حکام انگریز سے ابتدا سے خوشامدانہ تھے۔ اُن کا وظیفہ، ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کم بخت وظیفے کو واگزار کرانے کے لیے انہیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح میں اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے، پھر وقت بھی ایسا پُر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا اور سولی کے تختے اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ بڑی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے[۲]......"

"ہندوستانی زبان کے علاقے کی قومی بغاوت سے غالب کی یہ بیگانگی اور بغاوت کی ناکامی پر انگریز گورنروں اور افسروں کے سامنے اپنے رقیبے کی صفائی دیتے پھرنا، بظاہر ایک ایسے شاعر کے لیے نازیبا معلوم ہوتا ہے جو دربارِ شاہی کا منصب دار ہو اور اِشرافیہ میں اعلیٰ مقام رکھنے کا آرزومند ہو —— جس کے کلام میں جابجا آزادی اور آزادہ روی کے دعادی پائے جاتے ہوں اور جس نے بغاوت شروع ہونے تک بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی تعریف میں پے در پے فارسی قصائد لکھے ہوں اور جانثاری کے دعوے کیے ہوں لیکن اس بہ باطن بیگانگی اور بظاہر آشنائی کے پیچھے، جہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اقتدار پسند طبقے کی وفاداریاں سو سال پہلے سے بٹ چکی تھیں، غالب کے ددھیالی اور سسرالی خاندانوں میں بھی یہی رسم چلی آ رہی تھی —— وہاں اس حقیقت پر بھی نظر جاتی ہے کہ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، وہ کسی وقت بھی ہوش و حواس...... سے بے بہرہ نہیں ہوتے[۳]......"

یہ صحیح ہے کہ "ضرورت و احتیاج نے اُنھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے نظم و نثر میں لکھواتے تھے، تاہم "مرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور

۱؎ شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۷، ۵۹۸

۲؎ الہلال، کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء، بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۲، ۶۳

۳؎ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۸

ساٹھ ستر روپے کی پنشن اور خلعت، اُس زخمِ کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا، جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان، وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر پھر اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار و ملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی[1]۔"

لیکن ۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی و حقیقی محسوسات شعری پیکر میں نہیں ڈھلے۔ ان کا اظہار تو پھر ان کے خطوں میں ہوا ہے جو اس موضوع پر غالب نے زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی! خطوں میں انقلاب ستاون سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات! اور ان کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے ـــــ اشعارِ غالب، اس سے یکسر خالی ہیں۔ ـــــ اس امر پر اصرار کہ کلامِ غالب میں اس داستانِ اِلم کی تفاصیل محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اہلِ علم نے کلامِ غالب سے اس نوع کے نتائج، اُس صورت میں نکالے ہیں، جب انہوں نے غالب کے اشعار کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھا اور شاعر کے کلام کا مطالعہ تاریخی اور زمانی ترتیب سے نہیں کیا۔

O

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس کے اثراتِ مابعد کے بارے میں کلامِ غالب سے استشہاد کی روایت پٹنہ کے ڈاکٹر سید محمود* نے ڈالی، انہوں نے ۱۹۱۹ء میں دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور دو برس بعد ۱۹۲۱ء میں اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ڈاکٹر سید محمود نے بارہ تیرہ صفحات (ص ۳۳ - ۴۵) محض اس بحث کے لیے وقف کیے ہیں کہ "انقلاب ستاون کا غالب کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا، وہ سیاسی خیالات سے بے بہرہ نہیں تھے، انہیں ملکی و قومی تباہی کا بھرپور احساس تھا ـــ "، اپنے اس موقف کی تائید میں ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے تیس سے زیادہ اردو اشعار پیش کیے ہیں ـــــ لیکن اس نکتہ آفرینی کی کچھ حقیقت اور وقعت باقی نہیں رہتی، جب یہ معلوم ہو کہ غالب کے جن اشعار کو سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ بیشتر ۱۸۵۷ء سے ۲۵ تا ۴۱ سال پہلے کے ہیں جب غالب کی عمر ۱۹ سے ۳۴ سال کی رہی ہوگی۔ ان اشعار میں سے کسی ایک کا بھی انقلاب ستاون سے کچھ تعلق نہیں ـــ اگلے صفحات میں ڈاکٹر سید محمود کے مقدمے[2] کے متعلقہ اقتباسات و اشعار کو

---

[1] الہلال کلکتہ، ۱۷ رجون ۱۹۱۴ء بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، ایضاً، صفحہ ۶۲

[2] مقدمہ، اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، نظامی پریس، بدایوں طبع ششم، ۱۹۲۷ء، صفحہ ۹ - ۴۷.

* ڈاکٹر گیان چند کو التباس ہوا ہے کہ یہ ڈاکٹر سید محمود "سر سید کے صاحبزادے" تھے ـــ (صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۰)

راقم الحروف کے حواشی کی روشنی میں ملاحظہ کیجئے :

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب ...... ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

"غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں، جن میں انہوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں ——"

مجھے اس سے انکار نہیں، لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے۔ اس لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا (کے اشعار اور) عبارتیں نقل کر دی ہیں تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے اِن کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا ...... غالب نے کچھ تو اس زمانے کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اُردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو ...... تعجب کا کیا مقام ہے۔"

(مقدمہ، ۴۴)

———

"اُس زمانے میں جو حالات تھے اُس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں ہی میں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں" اور پھر کہتے ہیں :

زبان اہلِ زبان میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع [۱]

اور پھر کہتے ہیں :

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے ! اگر معرضِ اظہار میں آوے [۲]

---

[۱] بیاضِ غالب (نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۳ / ۱۳۵، ۱۳۵ ، نسخۂ عرشی زادہ، دہلی، ۱۹۶۹، صفحہ ۴۴) میں یہ شعر موجود ہے۔ یہ بیاض خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء میں مرتب ہوئی۔ ظاہر ہے یہ شعر ۱۸۵۷ء کی ملکی تباہی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

[۲] یہ شعر، نسخۂ رامپور ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء میں موجود ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۳۴) اسے بھی ۱۸۵۷ء کی تباہی سے کوئی نسبت نہیں۔

ایک اور جگہ جتایا ہے :

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے[۱]

(مقدمہ : ۴۲)

" ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے سے پہلے ہو چکا تھا اور اُس وقت کے شعراء اور صاحبانِ سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا اہل سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعراء نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور انہوں نے نہایت پُردرد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے :

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں[۲]

پھر کہتے ہیں :

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے[۳]

(مقدمہ : ص ۳۳، ۳۴)

---

[۱] یہ شعر، نسخہ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں شامل ہے۔ دیکھئے نسخہ حمیدیہ، مرتبہ : پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۲

[۲] ۲۳۔ شعبان ۱۲۶۶ھ ۴۔ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب قلعۂ معلّٰی سے متعلق ہوئے، شاہ دہلی نے انہیں خطاب اور خلعت دیا اور سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت، اُن کے سپرد ہوئی تو غالب نے طرزِ تازہ پر ایک غزل لکھی (دیکھیے، مکاتیبِ غالب عرشی طبع دوم، متن، ص ۵۲)۔ یہ شعر اسی غزل کے ہیں۔ ہنگامہ ستاون، ان اشعار کے کہے جانے کے سات برس بعد وقوع میں آیا، اس لیے ان اشعار کو، ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کا پُردرد نوحہ خیال کرنا، ہنسی کی بات ہے۔

[۳] یہ شعر بیاضِ غالب ۱۸۱۶ء میں موجود ہے (نقوش، ص ۲۲۴ - ۲۲۵؛ نسخہ عرشی زادہ، ص ۸۹) یعنی ہنگامہ ستاون سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا!

" ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اور نواحِ دلی پر جو آفتیں ٹوٹتیں، انھوں نے ہزار ہا بندگانِ خدا کو بے خانماں اور تباہ کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے دلی اجڑ گئی اور شرفاء کے مکان ویران و برباد کر دیئے گئے .... ان واقعات کو مرزا غالب نے بچشمِ خود دیکھا تھا، غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں[1] "

(مقدمہ، ص ۳۴)

---

[1] یہ شعر، نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے:
نسخۂ شیرانی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ورق ۴۲ ب (حاشیہ)
اِس لیے یہ یقیناً، ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق نہیں۔

"اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں...... خاص کر مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ مرزا لکھتے ہیں.........:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دل نہیں، دکھاتا ورنہ تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا[1]

(مقدمہ، صفحہ ۳۵، ۳۶)

"جو مصائب اہلِ ہند پر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور پھر اُس کے بعد نازل ہوتے، وہ بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے، جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن، اُن سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبّہ ہوں:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں"[2]

(مقدمہ: ۳۶)

---

[1] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں دیکھے جا سکتے ہیں (صفحہ ۲)۔ مقطع، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ایک غزل کے مقطع (نقوش، ص ۹۶-۹۷، نسخۂ عرشی زادہ ص ۲۵) کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۳۵، ۴۰ برس پہلے کے ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ۱۸۵۷ء میں "اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں۔" یا یہ اصرار کرنا کہ ان اشعار میں "وہ ان مظالم" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں "خاص کر مسلمانوں پر توڑے گئے" کسی طرح صحیح نہیں۔

[2] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۴۳-ب پر موجود ہے، یعنی ۱۸۵۷ء سے تیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے۔ اِس کی بنیاد پر یہ حکم لگانا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ "۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد اہلِ ہند پر جو مصائب نازل ہوتے، غالب نے انہیں خوبی سے شعر میں اُدا کیا ہے؟ یا یہ کہ غالب کی خواہش تھی کہ اُن کے ہم وطن ان مصائب سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبّہ ہوں۔۔۔؟؟"

"دلی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہلِ دہلی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کر لی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے لیکن حکامِ انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہ ہوا ہنگامے کے حالات اُن کو فراموش نہ ہوتے۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ اُمرا کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ غربا کے مکانات مسمار کر دیئے گئے۔ مرزا ان حالات کا ذکر...... شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں:

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں"[1]

(مقدمہ: ۳۶)

"ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں: "بھائی، بری آبنی ہے"...... اور پھر جو سزائیں دی گئیں، ان کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں:

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں"[2]

(مقدمہ ۳۶، ۳۷)

"ایک دوست کو لکھتے ہیں: بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا، لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں، اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔" ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر.... کرتے ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ اس قسم کا سخت برتاؤ کیا ہوگا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھا۔ ان تمام خیالات کے ہجوم سے مرزا غالب اس قدر متاثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جاتا ہے اپنے دردِ دل کا اظہار ذیل کے اشعار میں کس خوبی سے اور کتنے پُر درد الفاظ میں کرتے ہیں:

---

[1] یہ شعر بھی نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے (ورق ۴۲۔ ب) اس لیے یہ کہنا کسی طرح دُرست نہیں کہ اِس میں اُس ہنگامے کے حالات کا ذکر شکایت کے پیرائے میں ہوا ہے جو بجائے خود اس شعر کے کامل اکتیس برس بعد ظہور پذیر ہوا۔

[2] یہ شعر، غالب کی اُس غزل کا ہے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر سے خطاب و خلعت اور خدمت پانے پر طرزِ تازہ میں ۴۔ جولائی ۱۸۵۰ء یا اس کے معاً بعد لکھی، اسے واقعۂ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں دیکھنا درست نہیں۔

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج "[1]

(مقدمہ ۳۸)

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اُن کے حُبِّ وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے مُلک کی بدنصیبی پر روتے ہیں۔ ایک...... جگہ فرماتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل، پایۂ تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ

---

[1] پہلا شعر، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۱۰۶-۱۰۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۲۰) اور دوسرا شعر، نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) صفحہ ۹۲ کے حاشیے پر موٹے قلم سے شکستہ خط میں تحریر ہوا ہے۔ گویا دونوں شعر، ۱۸۵۷ء سے ۲۵، ۴۰ سال پہلے کے ہیں، اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب نے یہ شعر اہلِ ہند کی تباہی اور بہادر شاہ کے اہل و عیال پر انگریز حکام کے ظالمانہ سلوک سے متاثر ہو کر قطعاً نہیں لکھے — غالب کے ایک جدید شرح نگار نے بھی ان اشعار کی توجیہہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے پس منظر میں کی ہے۔ اس کا یہاں درج کر دینا لُطف اور عبرت سے خالی نہ ہوگا:

"غالب کا یہ شعر غالباً اُن ایّام میں لکھا گیا جب کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء واقع ہوا، یا بعد میں مگر اشارہ انہیں حالات کی طرف ہے، جو اس ہنگامے میں دہلی والوں پر گذرے۔ یہاں "گلشن" سے مُراد دہلی سے ہے اور "قمری" دہلی والوں سے۔ اس وقت دہلی کی تمام آبادی بہ استثنا چند، جن کی رعایت انگریزوں کو منظور تھی، سب دہلی سے نکال دی گئی تھی۔ گھر کی محبت کس کو نہیں ہوتی اور بالخصوص جب بے سروسامانی کی حالت میں باہر پڑے ہوئے ہوں۔ باہر نکالے ہوئے لوگ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے شہر میں داخل ہوتے اور پہرہ داروں سے بچ کر اگر گھر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو حکومت کا تالا لگا ہوا دیکھ کر مایوسی کی وجہ سے چوکھٹ پر سر ٹکا دیتے۔ اس زمانے میں کنڈا، زنجیر عام طور پر نیچے چوکھٹ میں ہی لگائی جاتی تھی۔ ان حالات کا بیان غالب اس شعر میں کرتے ہیں .... دوسرا شعر بھی اسی تأثر کے تحت لکھا گیا ہے۔"

(صاحب زادہ احسن علی خاں، مفہوم غالب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۹ء ص ۱۳۴)

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ [1]

(مقدمہ: ۳۹)

"ایک خط میں لکھتے ہیں: خدا نہ کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔" "ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟...... ان تمام واقعاتِ دل خراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں [2]

کس قدر معنی خیز اور درد ناک شعر ہے۔"

(مقدمہ: ۳۹)

"اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے۔ اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمتے۔ فرماتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں [3]

(مقدمہ: ۳۹-۴۰)

---

[1] یہ اشعار بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) سے ماخوذ ہیں (نقوش، ص ۱۹۲-۱۹۳، نسخۂ عرشی زادہ ص ۷۳) یعنی ۱۹ برس کی عمر کے غالب کے اور انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۴۱ برس پہلے کے۔

[2] [3] یہ اشعار غالب کی اس غزل سے ہیں جو دہلی اردو اخبار جلد ۱۳، نمبر ۳۲ مورخہ ۲۱۔ شوال، ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸۔ اگست ۱۸۵۲ء میں اس تمہید کیساتھ شائع ہوئی تھی کہ یہ اس ہفتے کا کلام ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۴۷) ظاہر ہے یہ اشعار، اس وقت کے ہیں جب دلی آباد، قلعہ معمور، سلطنت بدستور اور ملکی آبادی موجود تھی!

"اس وقت ملک کی جو حالت تھی، اُسے یاد کر کے کہتے ہیں :

کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے[1]"

(مقدمہ: ۴۰)

"اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں :

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں[2]"

(مقدمہ: ۴۰)

"جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے، اُس وقت سے برابر، ان کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں۔ اور یہ کہا گیا کہ ملکِ ہندوستان کی حکومت، ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہلِ ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں :

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک[3]" (مقدمہ: ۴۱)

---

[1] یہ شعر ۱۸۵۷ء سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے اور بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ۲۶۶، ۲۶۷؛ نسخۂ عرشی زادہ، ۱۱۰)

[2] یہ شعر ملکی آزادی کے جانے سے کئی برس پہلے (اگست ۱۸۵۲ء) کا ہے!

[3] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۱ء میں شامل ہیں (نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۲۸) اور کوئی متعین سیاسی پس منظر نہیں رکھتے۔

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اُن کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال، یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے باکمال شاعر اور صاحبِ دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں انہوں نے اس کا مرثیہ لکھا، وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رُلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا:

ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اَے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے[1]

(مُقدمہ: ۳۷، ۳۸)

حقیقت یہ ہے کہ اشعارِ غالب کا واقعاتِ ستاون پر انطباق اور اشعارِ غالب کے لیے سنہ ستاون کے چوکھٹے یا پس منظر کی فراہمی، تاریخی غلطی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاق و سباق میں کلامِ غالب کی توجیہہ، دراصل نتیجہ ہے، غالب کے کلام کی زمانی ترتیب سے صرفِ نظر کا ___ جب اور جہاں.

---

[1] غالب کی یہ غزل ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے اکتیس برس پہلے کی زائیدۂ فکر ہے یہ نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۶۱۔ الف پر مندرج ہے۔ اس غزل کو ۱۸۵۷ء کے حوالے سے "دل ہلا دینے اور خون کے آنسو رُلوا دینے والا دردناک مرثیہ" قرار دینا، تاریخی اعتبار سے صریح غلطی ہے۔

غالب کے مفسّروں نے اِس کا لحاظ نہیں رکھا، استنباطِ نتائج میں ٹھوکر کھائی ہے۔

○

غالب کے شعری رَدّیے پر انقلابِ ستاون کے اثرات کا کچھ اندازہ، خطوطِ غالب کے حوالے سے ممکن ہے۔ اَشراف و اعیان ہی انقلاب کا شکار نہیں ہوئے؛ یہ سیلابِ بلا ہمارے بیش قیمت علمی اور تہذیبی سرمائے کو بھی بہائے گیا، قلمی نسخے مِٹ گئے، کتابیں لُٹ گئیں:

"انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو، اُس کا پتہ کیونکر لگے؟ لُوٹ کا مال چوری چوری کونے کھتروں میں بِک گیا اور اگر سڑک پر بھی بِکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو:

بر دل نفس اندہ گیتی بسر آرید
گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

(ثاقب، ۸۰ فروری ۱۸۵۸ء)

"آپ مرزا صابر (قادر بخش) کا تذکرہ (گلستانِ سخن) مانگتے ہیں۔ اِس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا، اب ایک مجلد اُس کا کہیں نظر نہیں آتا[1]"

(بنام حبیب اللہ ذکا، ۱۲ر مئی ۱۸۶۶ء)

"خداوند کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرتِ شیخ (کلیم اللہ جہاں آبادی) کا کلام اور صاحب زادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمت کا حال پوچھتے ہو؟ "ایں دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب بُرد و قصاب در راہ مُرد" بادشاہ ظفر، کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور (بہادر شاہ ظفر کے مُرشد) کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پُرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمت اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اُس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اَب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اَب جب لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدّعا حاصل نہیں ہو سکے گا۔"

(احمد حسن مودودی، یکم ستمبر ۱۸۶۳ء)

---

[1] مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ "گلستانِ سخن"، ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مرتضوی، دہلی سے پہلی بار شائع ہوا۔ طبع اوّل کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو، پاکستان (کراچی) کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے اور ایک مجلد مجلس ترقی ادب، لاہور کے کتاب خانے کی زینت ہے۔

خود غالب کے سرمایۂ علمی کا ایک بڑا حصہ، ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد میں غارت ہوا۔ اس آفت کا ذکر انہوں نے اپنے خطوں میں اکثر بڑے درد اور حزن و رقت کے ساتھ کیا ہے:

"حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا۔"

(نواب کلب علی خاں، ۲۲ر ستمبر ۱۸۶۶ء)

"غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟"

(یوسف علی خاں عزیز، نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے۔ جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے، اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۵۹ء)

"میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی، وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سو ان دوستوں کا، زمانۂ غدر میں گھر ہی لٹ گیا، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلامِ نظم و نثر کہاں سے لاؤں؟"

(تمنا مرزا پوری، ۱۲۔ جولائی ۱۸۶۷ء)

"میرا ایک سببی بھائی ہے، نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ، وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا...... سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتاب خانہ، ڈر کر عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔"

(صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء)

"کیا کہوں تم سے، ضیاء الدین خاں جاگیردار، لوہارو، میرے سببی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظم فارسی" چون پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیم روز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر سو، سوا سو، جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی

ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی، اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ، خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے، ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوالوں گا۔"

(آرام، ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔"

(جنوں، ۲۲۔ فروری ۱۸۶۱ء)

یہی نہیں کہ غالب کا سرمایۂ علمی، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد کی نذر ہوا۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ستم یہ کہ اس غارت گری کے نتیجے میں غالب کا ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا، سخن سنجی اور جوہر فکر کی درخشندگی جاتی رہی۔ قوتِ ناطقہ پر تصرف باقی نہ رہا اور وہ شعر سے بیزار ہو گئے:

"بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی اور اردو سرتاسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ۔۔۔۔۔۔ دو تین غزلیں فارسی، ہندی۔۔۔۔۔۔۔ لکھی ہیں۔"

(نواب کلب علی خاں، ۱۰ر ستمبر ۱۸۶۶ء)

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد (۱۸۵۷ء) کے بعد ایک قصیدہ جو "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) میں ہے اور ایک قصیدہ (مارچ اپریل ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال (جارج ایڈمنسٹن) کی مدح میں ایک اور قصیدہ (مارچ ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب (سر رابرٹ منٹگمری) کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اِس نظم کے سوا، اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجئے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر

ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ آپ عزدہ اور غمگسار ہوں۔ اِس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سَر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں۔"

(جنوں بریلوی، ۸۔ستمبر ۱۸۵۹ء)

"مَیں اَموات میں ہوں، مُردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟.... گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے..... خلعت (وغیرہ)...... مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اَب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں، دربار میں بُلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعتِ شعر، اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیئے، دماغ چاہیئے، ذوق چاہیئے، اُمنگ چاہیئے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اُس کے اَسباب کہاں؟ اِنّا لِلّٰہ واِنّا اِلیہ راجعُون۰

(چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۹ء)

"اَشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اَشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کُفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، ہزل و ہجو، میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اَشعار آجاتے ہیں۔ اَصلاح پا جاتے ہیں۔ باور کرنا اور مُطابقِ واقعہ سمجھنا۔"

(علائی ۲۔جولائی ۱۸۶۰ء)

"مَیں شاعرِ سُخن سنج، اَب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھُوٹ گیا۔ اَپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ مَیں نے کیوں کر کہا تھا؟۔"

(تفتہ، ۱۱۔اپریل ۱۸۵۸ء)

"نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو وہی دو چار ورق ("دستنبو") اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں..... جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لو گے۔"

(مجروح، ہفتم فروری ۱۸۵۸ء)

"نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں؟ ۔۔۔ پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دلوا سکتا۔"

(سیّد احمد حسن ۲۱۔ستمبر ۱۸۶۰ء)

"قصیدے کا قصد ..... تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکے کے کہ وہ پچاس برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے؟"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۹- نومبر ۱۸۶۰ء)

"از دیر باز بنظم و نثر نمی گرایم. نظم خواہی پارسی، خواہی اردو، خوابیست فراموش۔"

(رافت بھوپالی، انشائے نورچشم، ۱۴- اپریل ۱۸۶۱ء، بحوالہ:
مقدمہ دیوانِ غالب، عرشی ص، ۶۸)

"میاں! تمہاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمہاری خاطر سے کہہ کر بھیجے تھے (ایلن برون کے بیٹے کی ولادت کا اکیس شعری قصیدہ اردو، جسے آرام نے غالب سے لکھوا کر ایلن برون کو پیش کیا) سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہ گار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے؟۔"

(شیونرائن آرام، ۲۲- اپریل ۱۸۵۹ء)

"گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بداست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تونیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثرِ فارسی کی فرمائشیں کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ مُردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے؟"

(غلام نجف خاں (؟) ۱۸- جولائی ۱۸۵۸ء)
[خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر جلد ۲، صفحہ ۱۲۲]

"میرا حال اس فن (شعر و سخن) میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے شعر سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے، سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۸ء)

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں...... کتابیں کیا چھپواؤں گا۔"

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"اگر مجھے قوتِ ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو...... حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔"

(جنوں بریلوی، ۴ جنوری ۱۸۶۴ء)

"اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری، اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے۔"

(جنوں بریلوی، ۱۹ جون ۱۸۶۳ء)

"اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔"

(تفتہ، ۱۸۶۳ء)

"اِدھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپے کی تدبیر، حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔"

(تفتہ، ۴ مارچ ۱۸۶۳ء)

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو!"

(تفتہ، جولائی ۱۸۶۳ء)

"ہے ہے تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالبؔ شعر کہتا ہے؟ یا کہہ سکتا ہے؟"

(نیرؔ کاکوروی ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

"ساٹھ برس کی زندگی میں غالب کے ذہن اور زندگی پر یہ آخری اور سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے، اُن کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم اردو میں زیادہ۔"

(غالب شناسی، بمبئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۱)

انقلاب ستاون نے غالب سے ولولۂ شعری چھین لیا، ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے درمیان غالب نے گنتی کے شعر کہے، سخن سنجی جاتی رہی اور حرف سخن فہمی رہ گئی تھی اسی لیے شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ:

"غدر اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے .... دو تین اردو غزلیں اور چند فارسی قصائد ... ان سے ایک علاحدہ دورِ شاعری، ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں — حقیقتاً یہ زمانہ مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا —"

(غالب نامہ، طبعِ اوّل ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۱)

غالب نے اسی زمانے میں یہ جو لکھا ہے کہ: "اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار" یہ بے مبالغہ اور بیان واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرم کی اشعار شماری کے مطابق:

"چوتھے دور (۱۸۵۶ء — ۱۸۶۹ء) میں جس میں شاعر کا چودہ برس کا کلام درج ہے، مرزا غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اردو میں لکھی ہیں —"

(غالب نامہ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۶۳)

اکرام صاحب کے یہ اعداد و شمار قریب چالیس برس پہلے کے ہیں۔ اس دوران میں نئے مآخذ سے غالبیات میں اضافہ ہوا ہے۔ غالب کے خطوط یا دیگر ذرائع کی بنیاد پر، اب ہم غالب کے جن اردو اشعار کو ہنگامۂ ستاون کے بعد سے آخر عمر ۱۸۶۹ء تک کے درمیان کا قرار دے سکتے ہیں، اُس کی تفصیل یہ ہے: سات غزلیں، گیارہ قطعات، چار قصائد، تین رباعیات، ایک مرثیے کے تین بند، تین شعر مثنوی کی صنف سے اور کچھ مفرد اشعار! یہ ہے انقلاب اور اس کے بعد سے انتقال تک کے بارہ برسوں کا کل شعری اکتساب، اس کا بھی زیادہ حصہ غالب کے لفظوں میں "بلند رتبہ نہیں" — ان میں سے بیشتر چیزیں فرمائشی، ہنگامی اور وقتی نوعیت اور اہمیت کی ہیں — انقلاب ستاون کی غارت گری کے اس المیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا:

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(بنام مہر ۱۸۵۸ء)

اس کے برعکس نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب ستاون کے بعد ہوا۔

"حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء — ۱۸۶۹ء) مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا[۱]"

— ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

۱۔ غالب نامہ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۷۱

"اِس زمانے (۱۸۵۷ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالب) زندہ رہے، ان کی توجہ نثر پر رہی، فارسی میں کم اور اُردو میں زیادہ [1]"

——ڈاکٹر ظ۔ انصاری——

غالب کی معروف اور ضخیم فارسی نثری کُتب "پنج آہنگ" (۱۸۴۹ء) اور "مہر نیمروز" (۱۸۵۴ء) انقلاب سے پہلے کی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فارسی نثر میں غالب کی صرف دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں: ایک "دستنبو" (۱۸۵۸ء) اور دوسری "قاطع بُرہان" (۱۸۶۲ء) جس کی دوسری اشاعت معمولی ردّو بدل اور کچھ مزید فوائد مطالب کے ساتھ "درفشِ کاویانی" کے اضافی نام کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں سامنے آئی۔ "دستنبو" براہِ راست انقلابِ ستاون سے مُتعلق ہے جبکہ "قاطع بُرہان" کو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے بقول: "دستنبو" کا تتمہ معنوی سمجھنا چاہیے [2]"

اُردو نثر میں غالب کی کوئی کتاب سرے سے ماقبل انقلاب شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی نثرِ اُردو کی سب کی سب کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد چھپیں۔ مُباحثۂ بُرہان کے سلسلے کی چار کتابیں: لطائفِ غیبی (۱۸۶۴ء)، نامۂ غالب (۱۸۶۵ء) سوالاتِ عبدالکریم (۱۸۶۵ء) اور "تیغِ تیز" (۱۸۶۸ء) تو لکھی بھی گئیں ۱۸۵۷ء کے بعد۔ یہ ایک سلسلے سے اَیامِ انقلاب میں غالب کی خانہ نشینی کا حاصل ہیں۔ خطوطِ غالب کے سارے مجموعے بھی انقلاب کے بعد منظرِ عام پر آئے، دو اُن کی زندگی میں: "عودِ ہندی" (۱۸۶۸ء)، "اُردوئے مُعلّیٰ" (۱۸۶۹ء) اور مُتعدد اُن کی زندگی کے بعد: "مکاتیبِ غالب" (۱۹۳۷ء) "نادراتِ غالب" (۱۹۴۹ء)، "غالب کی نادر تحریریں" (۱۹۶۱ء) وغیرہ —— ان خطوط کا اسّی فیصد سے مُتجاوز حصّہ انقلابِ ستاون کے بعد کا ہے۔

اِس عقب میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اِس انقلاب کے بعد ہوا۔ اور اُن کا کُل سرمایہ نثرِ اُردو کسی نہ کسی سطح پر اِس انقلاب ہی کی دین ہے۔

---

[1] غالب شناسی، طبع اوّل ۱۹۶۵ء، صفحہ ۸۱

[2] غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۷



مزارِ غالب کی پرانی صورت



نوتعمیر مزارِ غالبؔ

ضمیمہ اوّل :

مضمون اسد اللہ خاں غالب در باب :

تباہی شہر دہلی

مطبوعہ :

[رسالہ دہلی سوسائٹی ، شمارہ اوّل ۱۸۶۶ء ص ۲۲ - ۲۴]

رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارہ اول (مطبوعہ ۱۸۶۶ء در مطبع سراجی، دہلی) میں غالب کا ایک مضمون بعنوان: "مضمون نواب اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب"، چھپا ہے (صفحہ ۲۲-۲۴)۔ ختم مضمون پر غالب کا نام یوں درج ہے:

"راقم اسد اللہ خاں شاعر، غالب تخلص، برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں بہادر رئیس سونگ سونسا۔ مرقومہ ۱۱۔ ماہ اگست ۱۸۶۵ء"

یہ مضمون، غالب نے دہلی سوسائٹی کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۱۔ اگست ۱۸۶۵ء میں پڑھا۔ رسالۂ دہلی سوسائٹی کے پہلے شمارے میں اس جلسے کی روداد چھپی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جلسے میں اول دو اصحاب کے مضامین پڑھے گئے:

"پھر صاحب کمشنر بہادر نے نواب اسد اللہ خاں غالب سے فرمایا کہ میرزا صاحب آپ نے بھی کوئی مضمون ہماری سوسائٹی کے لیے لکھا ہے۔ نواب صاحب نے بیان کیا کہ میں نے کچھ لکھا ہے، مگر مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ کھڑا ہو کر سناؤں۔ اگر اجازت ہو بیٹھے بیٹھے پڑھوں۔ صاحب موصوف نے فرمایا بہت اچھا۔ نواب صاحب نے اسی وقت اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں کچھ حال تباہی شہر دہلی اور کمی بارش کا تھا۔ سب حاضرین جلسہ سن کر بہت خوش ہوئے اور نواب صاحب کی بہت تعریف کی۔"

(رسالہ دہلی سوسائٹی/۱: ۱۸۶۶ء صفحہ ۵)

رسالہ دہلی سوسائٹی کے تیسرے شمارے (مطبوعہ ۱۸۶۷ء، اکمل المطابع، دہلی) میں، ان مضمونوں کی فہرست دی گئی ہے جو سوسائٹی کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ اس فہرست میں غالب کے مضمون کا ذکر ان لفظوں میں ہے:

"نواب اسد اللہ خاں غالب درباب تباہی شہر دہلی"

(صفحہ ۲۹)

اس تحریر کا تعارف سب سے پہلے مالک رام نے کرایا (ادبی دنیا، لاہور، شمارہ ستمبر ۱۹۳۹ء) پھر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے ایک قیمتی مقالے "دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب"، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء (صفحہ ۴۹-۶۴) میں غالب کی اس تحریر کو نقل کیا۔ "احوالِ غالب" (مختار الدین احمد، علی گڑھ، جون ۱۹۵۳ء) میں بھی یہ تحریر صدیقی صاحب کے مقالے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ (۱۸۳-۱۸۶) غالب نے اپنے خطوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں غالب کی یہ واحد اردو تحریر ہے جو مطبوعہ صورت میں ہمیں ملتی ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر اسے اگلے صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

"محکامِ معدلت فرجام اور صاحبانِ والا مقام کی جناب میں اور حاضرینِ انجمن اور دانندگان ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے، اُس سے میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دہلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور ایسے فرماندہانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا، میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انہیں کی گولی بارود سے، اُن پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے چار دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی، قلعہ اور شہر اور باہر خون ریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی اس شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا[1]۔ قوم انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی۔ انہوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو عفوِ جرائم منظور رہا۔ مگر قہرِ حاکمِ حقیقی بدستور رہا، نہ مکین کا پتہ، نہ مکان کے آثار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے، مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی، وہ کدھر ہے؟ شعر:

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آں کہ شاہِ جہاں ساخت در زمانِ قدیم

رفعِ فتنہ و فساد، ظہورِ امن و داد مسلّم، لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی، خلافِ تقدیر، تدبیر بن نہیں آتی —— تین برس برابر کال رہا، ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری، طرح طرح کی مصیبت، رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سُلگنا، گھروں میں جابجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز۔ خاک شعلہ انگیز، دریا اور کوئے کا پانی زہر آب، مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب۔ اساڑھ اور ساون، برسات کے •

---

[1] "قہرِ الٰہی" کی تفصیل غالب نے مجروح کے نام ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں اس طرح رقم کی ہے:

"برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سنو: ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے، آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے، مبالغہ نہ سمجھنا، ہزارہا مکان گر گئے، سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوتے ہوئے دانے بہہ گئے، جنہوں نے ابھی نہیں بویا، وہ بونے سے رہ گئے، سن لیا دلی کا حال؟ ..."

دو مہینے تمام ہوئے۔ ساون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مہینہ ہوئے جس میں پانی اس قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لیے۔ پایانِ کار کا حال خدا جانے، خلق اس کے اسرار کو کیا جانے۔ گرانی اور ارزانی ایک امرِ عام ہے، مجھے خاص اپنے عرضِ مدعا سے کام ہے۔ بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں۔ سچ اگر پوچھیے تو نیم جاں ہوں:

ضعف[1] نے، غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں، نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں۔ سرکار کی خدمت گزاری کا مشتاق ہوں مگر اب حرف دو کام کے لائق ہوں۔ اگر کسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے، تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری کارائے میں آئے ——— یا اگر تحریرِ نظم و نثرِ فارسی و اردو کا حکم آوے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جاوے —

۱۸۰۶ عیسوی سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے سرکار انگریزی کا نمک خوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہِ بحر و بر حضرتِ فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا مدحت نگار ہوں۔ دو قصیدے میرے ولایت پہنچ گئے، ان میں سے ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آ گئی۔ تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود اور مطلع

---

[1] متداول دیوان میں "ضعف" کی جگہ "عشق" ہے لیکن آخر عمر میں انھوں نے لفظ عشق کو ضعف سے بدل دیا تھا۔ مصنف "سیرِ دہلی" ریاض الدین امجد نے غالب سے اپنی ایک ملاقات مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کے حال میں لکھا ہے کہ غالب کے سامنے یہ شعر پڑھا:

...... جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ "اے بھئی چپ رہو" یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا" عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔"

(سیرِ دہلی، مطبع حیدری، آگرہ، ۱۸۶۱ء، ص ۲۶، ۲۷، بحوالہ: احوالِ غالب ص ۵۰)

اس کا یہ ہے ؎

نامہ ز دکٹوریا چو نامور آمد   از اُفقِ نامہ آفتاب بر آمد[1]

یہ قصیدہ اس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جاتے اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جاتے۔ اب
مَیں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموعِ صاحبانِ عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔"

(۱۱- اگست ۱۸۶۵ء)

---

[1] ۶۵ اشعار کا یہ قصیدہ "کلیاتِ غالب" میں "قصیدۂ سی دیکم ہم در مدح شہنشاہ" کے عنوان سے چھپا ہے (کلیاتِ غالب)، طبع دوم، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۳ء ص ۲۶۳-۲۶۶) مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ: "اصل قصیدہ یا اس کا حصہ چند سال پیشتر بہادر شاہ کے لیے کہا گیا تھا۔ بعد ازاں اس میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ علی گڑھ کے مخطوطے میں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے۔" مخطوط علی گڑھ میں اس شعر "نامہ ز دکٹوریا الخ" کی یہ صورت درج ہے: شاہ دو دلی عہد عین یک دگر آمد

فتح بہ معنی مرادفِ ظفر آمد

(قصائد و مثنویاتِ فارسی، مرتبہ: مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۹ و ۲۴۲)

ضمیمۂ دوم:

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان

"........ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہدنامے کیے ہیں، اُن کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔"

— اعلان: ملکہ وکٹوریہ، انگلستان

"اِس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں، ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اِس میں نئی بات کیا ہوتی؟"

— فرمان: بیگم حضرت محل، لکھنؤ

"آپ کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کا اور مجھے سزا کا مستحق قرار دینے کا کیا حق ہے؟ ہندوستان پر حکومت کرنے کا آپ کو کس نے اختیار دیا؟ کیا آپ فرنگی لوگ بادشاہ ہیں اور ہم اپنے ملک کے اندر چور ہیں؟"

(انقلابی رہنما، نانا صاحب، بنام:

جنرل ہوپ گرانٹ، اپریل ۱۸۵۹ء)

○

" لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔"

(غالبؔ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

" حکم ہوا ہے کہ دو شنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت، سب خیر خواہانِ انگیز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر[1] صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔"

(غالبؔ، بنام: شیونراین آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر (۱۸۵۸ء) کو (دو شنبے) کے دن حسب الحکم حکام، کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمروِ ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ[2] اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں ۔۔۔"

(غالبؔ بنام: انور الدولہ شفق، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

○

" کمپنی کا راج اب ختم ہوا۔ اور اس کی جگہ پر ہندوستان کی حکومت کی باگ ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ہماری انگریزی رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے

---

[1] آرام کے نام، اس خط میں پندرہ بیت کا یہ فارسی قطعہ (روز گارِ چراغاں، اشتہارِ چراغاں) درج ہے۔ "دستنبو" طبع دوم (۱۸۶۵ء) میں بھی یہ شامل ہے۔

[2] ساٹھ بیت کا یہ فارسی قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان (شمار یافت، روز گار یافت) "دستنبو" طبع اول کے آغاز میں چھپا ہے۔

مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی ہتھیار رکھ دیں گے۔ ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود لیے لڑکوں کو باپ کی جائیداد اور گدّی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں یا مذہبی رسم رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اِس وقت تک جتنے عہد نامے کیے ہیں، اُن کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہ چھینا جائے گا۔ سارے ہندوستانیوں کے ساتھ ٹھیک اُسی طرح کا برتاؤ کیا جائے گا جس طرح انگریزوں کے ساتھ ......" ملکہ وکٹوریہ۔

ہندوستانی والیانِ ریاست اور ہندوستانی رعایا کے نام ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ اسی دن لارڈ کیننگ نے خود الہ آباد میں دارا گنج کے نزدیک قلعے کے نیچے یہ اعلان، ہزاروں آدمیوں کو پڑھ کر سُنایا ـــــ ملکہ انگلستان کی طرف سے اِس اعلان کے شائع ہوتے ہی، اس کے جواب میں اودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی طرف سے رعایائے اودھ کے نام، حمیتِ ملی اور غیرتِ قومی کا حامل ایک بصرت افروز اور ولولہ انگیز اعلان عام شائع ہوا جس کا ایک ایک لفظ بیگم حضرت محل کی بیدار مغزی اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے یہ اعلان اردو میں تھا۔ یہاں اس کے کچھ جملے، اس کے سرکاری انگریزی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کر کے، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

" ـــــ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا اعلان، جو ہمارے سامنے آیا ہے، بالکل صاف ہے۔ اِس لیے ہم ـــــ بہت سوچ سمجھ کر موجودہ اعلان شائع کرتے ہیں تاکہ متذکرۂ بالا اعلان کے خاص خاص اصلی مقصد ظاہر ہو جائیں اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اِس علان میں لکھا ہے کہ ملکِ ہندوستان جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا، اب ملکہ نے اپنی حکومت میں لے لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا۔ ہماری مذہبی رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں وغیرہ سب، جوں کی توں بنی رہیں گی، تو پھر وہ نئی بات کون سی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہو یا جس پر وہ بھروسہ کر سکیں؟

اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں، ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اِس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی؟ ـــــ کمپنی نے بھرت پور کے راجا کو پہلے اپنا بیٹا بتلایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا۔ لاہور کے راجا کو وہ لندن لے گئے اور پھر کبھی اُسے ہندوستان لوٹنے نہ دیا۔ نواب شمس الدین خان کو ایک طرف انہوں نے پھانسی پر لٹکا دیا اور دوسری طرف اُسے سلام کیا۔ پیشوا کو انہوں نے پونا اور ستارا سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لیے بٹھور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجا کو انہوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔

بہار، اڑیسہ اور بنگال کے راجاؤں کا انہوں نے نام ونشان تک نہیں چھوڑا ۔ خود ہمارے قدیم علاقے انہوں نے ہم سے یہ بہانہ کر کے لے لیے کہ فوج کو تنخواہیں دینی ہیں اور ہمارے ساتھ جو عہد نامہ کیا، اس کی دفعہ (۷) میں انہوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور زیادہ کچھ نہ لیں گے، اس لیے جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں، وہ اگر سب قائم رکھے جائیں گے، تو اس سے پہلے کی حالت میں اور اب اس نئی حالت میں کتنا فرق ہوا ؟

یہ سب تو پرانی باتیں ہیں ؛ لیکن حال میں بھی قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر ، اور باوجود اس بات کے ، کہ انگریزوں نے ہم سے کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے ___ ، انہوں نے بغیر کسی وجہ کے صرف یہ بہانہ لے کر کہ آپ کا برتاؤ اچھا نہیں ہے ، اور آپ کی رعایا غیر مطمئن ہے[1] ، ہمارا ملک اور کروڑوں روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہم سے پہلے کے نواب واجد علی شاہ سے غیر مطمئن تھی ، تو وہ ہم سے مطمئن کیسے ہو گئی ! اور کبھی کسی بھی فرماں روا کے لیے رعایا نے اپنی جان اور مال کو اس طرح قربان کر کے ، اپنی وفاداری کا ثبوت نہیں دیا ،

---

[1] "ملک اودھ کی رعایا برباد ہو رہی ہے ۔ فوج تنخواہ سے محروم ہے ۔ آئین و عدل کا نام و نشان نہیں ، ڈاکوؤں کے غول علاقوں کو برباد کرتے ہیں ۔ سرکار انگریز ان خرابیوں اور برائیوں کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی اور اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ملک اودھ کا تمام انتظام ہمیشہ کے لیے سرکار کمپنی کے سپرد کر دیا جائے ۔"

___ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی

(نقل اشتہار گورنمنٹ انگریزی جو ہر تھانے پر لگایا گیا : ۷۔ فروری ۱۸۵۶ء)

[بحوالہ : نجم الغنی ، تاریخ اودھ ، جلد پنجم ، صفحہ ۲۶۵ - ۲۷۰]

درحقیقت جو کچھ بدانتظامی یا بے اطمینانی اس وقت اودھ میں تھی ، وہ انگریزوں کی جان بوجھ کر پیدا کی ہوئی تھی ۔ لارڈ ہیسٹنگز لکھتا ہے :

"حقیقت میں اس طرح کا نظامِ حکومت قائم کرنے کی جس سے رعایا خوشحال ہو ، محض ایک ہی سچی اور کارگر ترکیب ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ انگریز ریزیڈنٹ کو واپس بلا لیا جائے اور نواب اودھ کو اپنی ریاست کے انتظام میں پوری طرح آزاد چھوڑ دیا جائے ۔ اس طرح اس علاقے کی بے اطمینانی کا سارا گناہ کمپنی کے سر پر ہے ۔"

Charles Ball :

History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 152

(بحوالہ ، پنڈت سندر لال ، سن ستاون ، علی گڑھ ، ۱۹۵۷ ، صفحہ ۲۴)

جس طرح کہ ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ[1] کیا ہے، پھر کیا کمی ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے ؟

---

[1] "ہم لوگوں میں یہ ایک رواج ہے کہ ..... پہلے کسی ملکی راجا کا راج لے لیتے ہیں اور پھر تخت سے ہٹاتے ہوئے راجا یا اس کے ولی عہد کی جھوٹی برائیاں کرنے لگتے ہیں : [Sir John Kay : History of the Sepoy War, Vol. III, p. 361—362]

(بحوالہ سن ستاون، ص، ۱۰۲)

"لارڈ ڈلہوزی کا بیان ہے کہ واجد علی شاہ کے مظالم سے اودھ کی رعایا دکھی تھی! لیکن جس طرح ۱۸۵۷ء میں ہمارے اودھ کے زمینداروں، جاگیرداروں، راجاؤں، سپاہیوں، کسانوں، سوداگروں غرض یہ کہ سب ہندو اور مسلمانوں نے مل کر واجد علی شاہ کو پھر سے اودھ کے تخت پر بٹھانے کے لیے دس دن کے اندر انگریزی حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دیا، اس سے واجد علی شاہ کی حکومت کی ہر دلعزیزی اور کمپنی کی حکومت سے ناراضگی دونوں کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔ اودھ کے اندر اس وقت ایک گاؤں بھی ایسا نہ بچا ہوگا جس نے کمپنی کے جھنڈے کو پھاڑ کر نہ پھینک دیا ہو۔"

(پنڈت سندر لال، سن ستاون، صفحہ ۱۱۱)

"سارے اودھ نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ نہ صرف باضابطہ فوج ہی بلکہ تخت سے اترے ہوئے نواب کی فوج کے ساٹھ ہزار آدمی، زمیندار، ان کے سپاہی، ڈھائی سو قلعے، جن میں سے بہتوں پر بھاری توپیں لگی ہوتی تھیں، سب کے سب ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں نے کمپنی کی حکومت کو اپنے نوابوں کی حکومت کے ساتھ تول کر دیکھ لیا تھا اور قریب قریب رائے سے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ان کے نوابوں کی حکومت، کمپنی کی حکومت سے بہتر تھی۔ جو پنشنر ہماری فوج میں کام کر چکے تھے، ان تک نے صاف صاف ہماری حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بغاوت میں شامل تھا۔" [Red Pamphlet, by : G.B. Malleson]

(بحوالہ سن ستاون، ص۔ ۱۱۳)

"اودھ کی رعایا نے قیدی نواب واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر کو لکھنؤ کے تخت پر بٹھا دیا اور چونکہ نواب برجیس قدر ابھی نابالغ تھا اس لیے نظام حکومت کی باگ برجیس قدر کی ماں حضرت محل کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔ اودھ کے سب زمینداروں اور رعایا نے بڑی مسرت کے ساتھ بیگم حضرت محل کو اپنا حکمران منظور کر لیا۔ بیگم حضرت محل کی تعریف کرتے ہوئے رسل لکھتا ہے:

اس کے علاوہ، اِس اعلان میں لکھا ہے کہ ملکہ کو اپنا علاقہ بڑھانے کی خواہش نہیں ہے، پھر بھی وہ، ان ہندوستانی ریاستوں کو اپنی حکومت میں ملا لینے سے باز نہیں رہ سکتی ۔

O

" اس اعلان میں لکھا ہے کہ عیسائی مذہب سچا ہے۔ لیکن اور کسی مذہب والوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی اور سب کے ساتھ ایک طرح کا قانونی برتاؤ کیا جائے گا۔ سچے نظامِ حکومت سے کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کیا تعلق ہے؟
سؤر کھانا اور شراب پینا، چربی کے کارتوس دانت سے کاٹنا اور آٹے اور مٹھائیوں میں سؤر کی چربی ملانا، سڑکیں بنانے کے بہانے مندروں اور مسجدوں کو گرانا، گرجا بنانا، گلیوں اور کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کے لیے پادریوں کو بھیجنا —— ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے لوگ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دخل نہ کیا جائے گا۔؟
اس اعلان میں لکھا ہے کہ —— جن لوگوں نے قتل کیے ہیں یا قتلوں میں مدد دی ہے، ان پر کوئی رحم نہ کیا جائے گا، باقی سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار یا بے قصور کوئی آدمی بھی نہیں بچ سکتا —— ایک بات اِس میں صاف کہی گئی ہے وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار آدمی کو نہ چھوڑا جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں یا علاقے میں ہماری فوج ٹھہری تھی، اُس کے باشندے نہیں بچ سکتے —— اس اعلان کو پڑھ کر جس میں کہ صاف دشمنی بھری ہوئی ہے، ہمیں اپنی رعایا کی حالت پر بہت افسوس ہے۔
اب ہم ایک صاف اور معتبر فرمان جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں سے جن جن لوگوں نے بے وقوفی کر کے گاؤں کے مکھیوں کی حیثیت سے اپنے تئیں انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں آکر حاضر ہوں۔ بلا شبہ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا —— آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریز نے کسی کا قصور معاف کیا ہو ۔

حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ :

" بیگم میں بڑی حماقت اور قابلیت دکھا دی ہے۔ بیگم نے ہمارے ساتھ لگاتار جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان ..... کی ہمت اور حماقت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی قوت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔ " اودھ کے لوگ "اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے لیے دلیش بھگتی کے جذبات سے متاثر ہو کر جنگ کر رہے تھے۔ "

[Russell's Diary, p. 275, p. 75]

بحوالہ : رسل ستاون، ص ۱۸۱ - ۱۸۹)

ہماری رعایا میں سے کوئی انگریزوں کے اعلان کے دھوکے میں نہ آتے۔"

— بیگم حضرت محل

Charles Ball :

History of the Indian Mutiny, vol. II

(بحوالہ سن ستاون، صفحہ ۲۲۰-۲۳۲)

۱؎ " لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے لکھنؤ کے باشندوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا وہ "کھلے عام لوٹ اور قتلِ عام" ہی لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ لفٹیننٹ ماجنڈی لکھتا ہے کہ: لکھنؤ کے اندر اس وقت کے قتلِ عام میں کسی طرح کی تمیز نہیں کی گئی ——"

[Lieut. Majendie's up among the Pandies, p. 195—196]

قتل سے پہلے جس طرح کی سخت تکلیفیں لوگوں کو دی گئیں، اس کی کئی مثالیں رسل نے اپنی کتاب میں دی ہیں ان میں سے صرف ایک ہم نیچے نقل کرتے ہیں:

" کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور ان پر رحم کر کے انہیں مار ڈالا گیا، لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر ریتیلے میدان میں لایا گیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا، ایک سہولت کی جگہ لایا گیا، وہاں اس کو لٹا دیا گیا۔ کچھ انگریز سپاہیوں نے اس کے منہ اور جسم میں سنگینیں بھونک کر اسے لٹاتے رکھا۔ دوسرے لوگ لاش کو جلانے کے لیے لکڑی جمع کر لاتے۔ جب سب تیار ہوگیا تو اسے زندہ بھون دیا گیا! اس کام کے کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے لیکن کسی نے مداخلت نہ کی! اس دوزخی ظلم وستم کی خوفناکی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب کہ اس بدقسمت ستم زدہ نے ادھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی۔ یکایک کوشش کر کے وہ چتا سے کود پڑا۔ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ گز دوڑا، پھر پکڑ لیا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہوگیا، سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا ——"

[Russell's Diary, Vol., p. 302]

اس کے مقابلے میں انگریز قیدیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کا سلوک بالکل دوسری طرح کا تھا۔ شروع کے دنوں میں جب کہ لکھنؤ کے اندر انقلابیوں کا پلہ بھاری تھا، کچھ انگریز مرد اور عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے لیکن چھ مہینے تک ان کی جان پر کوئی حملہ نہ کیا گیا۔ جب وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر قصوروار اور بے قصور سب کا ایک طرف سے قتلِ عام شروع کیا، کچھ جوشیلے انقلابیوں نے محل میں جاکر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ بیگم نے سات یا آٹھ انگریز مردوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ انہیں فوراً گولی سے

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

اڑا دیا گیا۔ لیکن جب کچھ انقلابیوں نے ضد کی کہ قیدی انگریز عورتوں کو بھی مار ڈالا جائے تو بیگم نے انکار کر دیا۔
مورخ چارلس بال لکھتا ہے:

"عورتوں کے بارے میں بیگم نے اُن لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے زوروں کے ساتھ انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ کام عورتوں کی شان اور آن کو بڑھانے والا تھا۔"

Charles Ball :
History of the Indian Mutiny, Vol. II, p. 94
(بحوالہ: پنڈت سندر لال، سن ستاون، صفحہ ۱۹۲-۱۹۴)

حرفِ آخر:

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

کتاب طباعت کے لیے جارہی ہے، یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے لیکن اِس مرحلے پر غالب کے رشتے سے کچھ رفتگان کی یاد مجھے بے چین کیے دے رہی ہے۔ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں آگے پیچھے دیکھتے ہی دیکھتے مولانا غلام رسول مہر (وفات: ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) ڈاکٹر ایس ایم۔ اکرام، (۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۔ مارچ ۱۹۷۳ء) اور پروفیسر حمید احمد خاں (۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء) راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ آج انہیں اپنے درمیان نہ پاکر، دل خون ہو ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں غالب شناس کے طور پر جو آٹھ دس قد آور نام اُبھرے، اُن میں مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر حمید احمد خاں کا اپنا ایک الگ اور منفرد مقام ہے۔ یہ اَسماء گزشتہ نصف صدی سے غالبیات پر چھائے ہوئے تھے اور سند چلے آرہے تھے۔ جیسے آثار ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ غالب کو ایسے رچے، کڑھے ہوئے لسانی اور تہذیبی شعور اور شغف رکھنے والے قدیم اور جدید علوم کے جامع اب کبھی نصیب بھی نہ ہوں:

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

غالبیات کے اِن مُسلّمہ اکابر سے مجھے ایک نسبت رہی ہے ——— مولانا غلام رسول مہر کی ذات سے کیسی کیسی عزیز اور حسین یادیں وابستہ ہیں۔ غالب کے رشتے سے وُہ مجھ پر جیسی مہر و محبت فرماتے تھے، جتنا وقت دیتے تھے اور جس لُطف و عنایت کا مجھے مورد رکھتے تھے،۱ اُس کا مَیں نے کبھی اپنے آپ کو اہل نہیں جانا، اُس پر فخر جتنا بھی کروں کم ہے!

غالب پر ڈاکٹر ایس ایم۔ اکرام کے کام نے مجھے ہمیشہ بہت مُتاثر اور مُطمئن کیا اُن کی طلبِ علم اُن کے علم سے بھی بڑھی ہوئی تھی جس نے اُنہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ یہ طلب مزید ہی کا فیض اور اِنعام ہے کہ اُن کی ہر کتاب کا نیا ایڈیشن بجائے خود ایک نئی کتاب کا لُطف بہم پہنچاتا ہے! اکرام صاحب کے عالمانہ انہماک کی قسم کھائی جا سکتی ہے، لیکن مَیں اُن کی "متعلمانہ" خو بو اور جستجو کا بھی قائل اور گھائل رہا ہوں۔ غالب کے حوالے سے وُہ متعدد بار غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے مسرور اور مُفتخر کیا! ۱۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو اکرام صاحب کے جسدِ خاکی کا آخری دیدار کرتے ہوئے بے اختیار حالی کا یہ شعر زبان پر آتا تھا:

دیکھ لو آج، پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت!

مجھے خوب یاد ہے، اسی روز نمازِ جنازہ کے بعد پروفیسر حمید احمد خاں نے پُرسا دینے کے انداز میں مجھے گلے لگایا تو مَیں پھوٹ بہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ بارہ چودہ مہینے بعد مجھے خود حمید احمد خاں صاحب کو بھی رونا پڑے گا!

پروفیسر حمید احمد خاں سے اگرچہ صرف آٹھ دس برس کا تعلق تھا لیکن یہ کس درجہ عزیز اور کس قدر دیرینہ اور مُحکم معلوم ہوتا تھا! اُن کی خوئے دل نوازی نے خود مجھے اپنی نظر میں آپ مُعتبر اور محترم بنایا۔ مجھے ایک مختصر سی مدّت کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں اُن کی رفاقتِ کار کا شرف بھی حاصل ہُوا۔ اُن کے رکھ رکھاؤ اور وضع داری، تہذیب و شائستگی کی کتنی ہی پُر تجمّل اور پُر افتخار یادیں ہیں جن سے ذہن مُنوّر اور معمور ہے، لیکن یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ غالب میری منزل ہے،

۱۔ میری کتاب "اِشاریۂ غالب" پر مولانا غلام رسول مہر کا مضمون، مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۶ غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء ص ۲۰۲-۲۱۴، میرے حال پر مہر صاحب کی عنایات ہی کی ایک کڑی ہے۔

یہ "دریافت" بڑی حد تک پروفیسر سیّد وقار عظیم اور پروفیسر حمید احمد خاںؒ کی ہے۔ اُنہوں نے مجھے کام پر لگایا، بڑھایا اور بظاہر میرے لیے عمر بھر کی راہ مُتعیّن کر دی۔

"پروفیسر حمید احمد خاں نے کم لکھا، لیکن جو لکھا، وہ کم رتبہ نہیں۔ اِظہار میں احتیاط اور صحت و کمال اور اِتمام کا خیال، ہمیشہ اُن کا عناں گیر رہا۔ یہ ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہی تھا جس نے، اُن کے قلم پر ایک روک لگا دی تھی، نتیجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ لکھا، اُس پر کہیں انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ غالب کی حیات، شخصیت، اُن کی نظم و نثر یا بحیثیتِ مجموعی غالب کے فن پر پروفیسر حمید احمد خاں کا لکھا ہوا، ایک ایک لفظ، مَعنویت سے بھرپُور ہے اور عینی معیار کا درجہ رکھتا ہے۔"

ترقّیِ اُردو بورڈ کراچی سے اپنی منصبی وابستگی کے زمانے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری سے شخصی سطح پر باہم اِعتماد، اور مُحبّت کا جو تعلق قائم ہوا، وُہ آخر دم تک بَرقرار رہا اور قوی تر ہوتا گیا۔ سبزواری صاحب کا علم ہی بیکراں نہ تھا، ترسیلِ علم کا بھی اُنہیں ایک طرح سے، کہہ لیجیے کہ جنون تھا۔ اُن کی صحبت اور رفاقت سے مَیں نے توفیق بھر فیض پایا۔ اِبتداءً مولوی عبدالحق، ہم دونوں کا محبوب اور مُشترک موضوع تھا، پھر غالب کا تذکرہ بھی رہنے لگا۔ غالب کے فلسفے اور فکر و فن پر سبزواری صاحب کو نفسِ مُطمئنہ حاصل تھا۔ اَب سوچتا ہوں تو غالب سے اپنی قربت میں مُنجملہ اور اَصحاب اور اَسباب کے، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ہم نشینی کا بڑا عمل دخل محسوس ہوتا ہے:

اَب نہ دُنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

اِسی لیے کہتا ہوں کہ: "کتاب، طباعت کے لیے جا رہی ہے، یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے، لیکن اِس مَرحلے پر غالب کے رشتے سے کچھ رفتگاں کی یاد، مجھے بے چین کیے دے رہی ہے۔"

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج۔ لائل پور

۱۸۔ جون ۱۹۷۴ء

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کی ذات، نئی نسل میں غالبیات سے اِنہماک کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے لیے اُنھوں نے "اشاریۂ غالب" ایسی اہم کتاب لکھی، سندھ یونیورسٹی کے لیے انھوں نے غالب پر تحقیقی کام کیا اور سندِ فضیلت پائی اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ پاکستان بھر میں مُعین صاحب کے علاوہ کوئی دُوسرا شخص ایسا نہیں جس نے غالب پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر کام کیا ہو۔

اب "غالب اور انقلاب ستاون" کے حساس موضوع پر ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کی زیرِ نظر کتاب سامنے آ رہی ہے۔ یہ غالب کا معروضی مُطالعہ ہے اور غالب کو ایک بالکل نئے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ مُعین صاحب نے ایامِ انقلاب میں غالب کے رول کو کامیابی کے ساتھ متعین کیا ہے اور انقلاب ستاون۔ کے حوالے سے غالب کے شعری رویّے کا احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ: "اس انقلاب نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جبکہ نثر نگار غالب نے اِس انقلاب کے بعد ظہور پایا۔"

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن نے اپنے اِس موقف کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے اور اس کی تائید میں ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور اس خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ ان کی بات مانے بغیر چارہ نہیں ـــــ مختصر یہ کہ مُعین صاحب کی یہ کتاب مواد کی فراہمی، نتائج کے استنباط اور اپنے سلیقۂ اظہار کی بنا پر ادبِ غالب میں بہت قیمتی اور گراں قدر اضافہ ہے ـــــ اُمید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کا پُرجوش استقبال کیا جائے گا۔"

محمد عبدالرحمٰن چغتائی

مُصوّرِ مشرق
مُصوّرِ غالب